طلوعِ اسلام

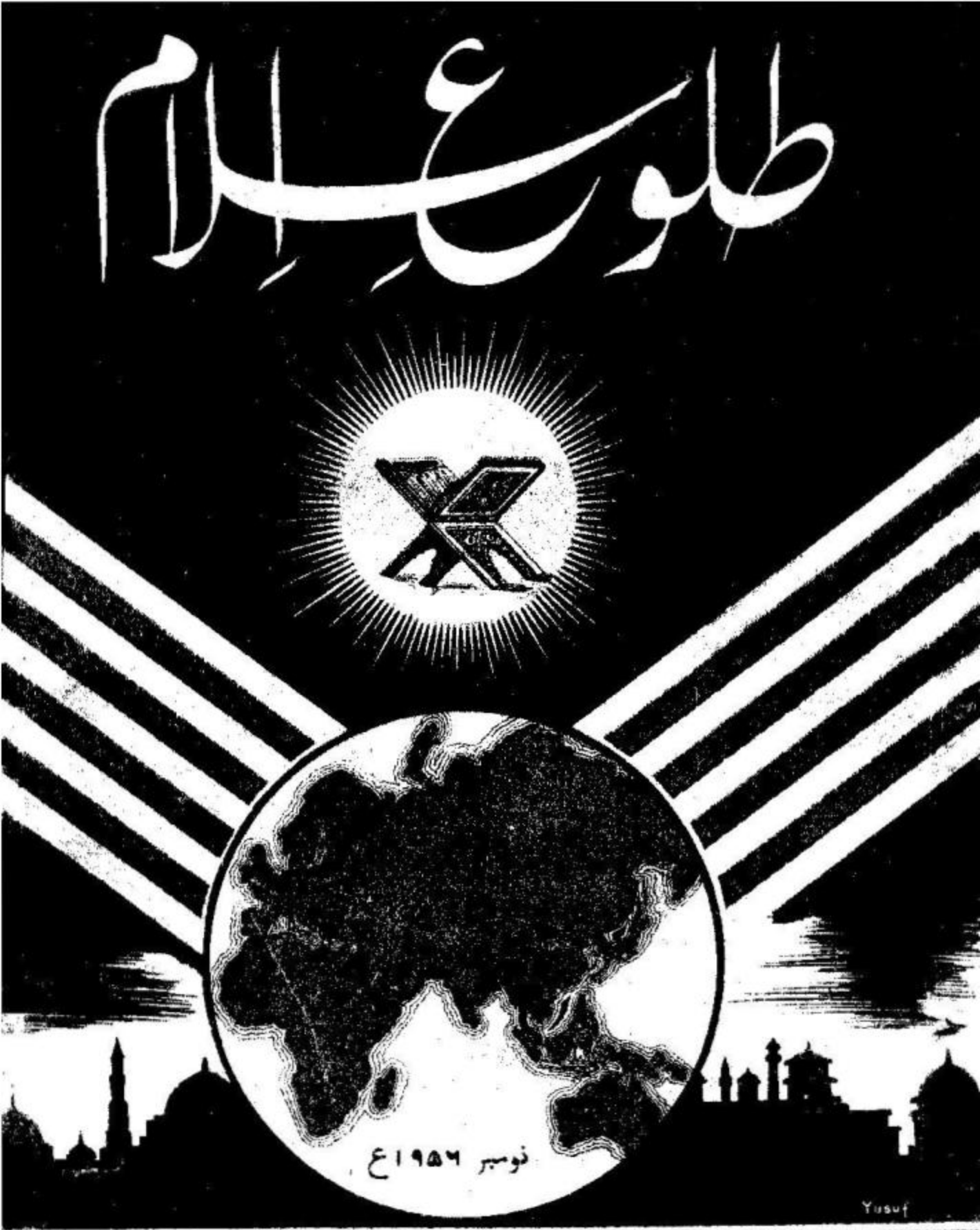

نومبر ۱۹۵۶ء

Yusuf

ادارہ طلوعِ اسلام لاہور

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوع اسلام

کراچی

ٹیلیفون نمبر ۳۱۰۸۸		ہندوستان اور پاکستان سے
خط وکتابت کا پتہ	قیمت فی پرچہ	سالانہ بدل اشتراک
۱۵۹/۳ ایل پی، ای، سی، ایچ	ہندوستان اور پاکستان سے	آٹھ روپے
سوسائٹی کراچی ۲۹	بارہ آنے	غیر ممالک سے ۱۳ شلنگ

جلد ۹ ‖ نومبر سنہ ۱۹۵۶ ء ‖ نمبر ۱۰

فہرست مضامین

لمعات (انتخاب) ۱ — ۱۶

سلیم کے نام خط ۱۷ — ۲۹

(محترم پرویز صاحب)

مجلس اقبال ۳۱ — ۳۸

حضرت عائشہ رض کی عمر (شادی کے وقت) ۴۱ — ۴۹

(محترم پرویز صاحب)

قرآن کریم کے نسخے ۵۰ — ۵۵

(محترم قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی)

حقائق و عبر ۵۷ — ۵۹

باب المراسلات ۶۰ — ۶۴

قرآنی معاشرہ (محترم عمر احمد عثمانی صاحب) ۶۵ — ۷۵

طلوع اسلام کنونشن ۷۶ — ۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

آپ نے سورۂ نحل کی اس آیت مقدسہ کو تو کئی مرتبہ پڑھا ہوگا جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (۱۶/۹۲) "تم اس بڑھیا کی طرح نہ ہو جانا جو سارا دن محنت سے سوت کاتتی ہے اور پھر شام کو خود اپنے ہی ہاتھوں اسے بکھیر کر رکھ دیتی ہے۔" آپ شاید (بچوں کی طرح) سوچتے ہوں گے کہ یہ بڑھیا وہ ہے جو چاند میں بیٹھی ہوئی چرخہ کات رہی ہے۔ یہ بڑھیا چاند میں نہیں۔ اسی زمین پر ہے۔ اور اس زمین میں بھی خود پاکستان کے بابرکت خطہ میں۔ اور اس کا نام ہے ملت شریفۂ پاکستانیہ۔ یہ وہی ملت ہے جس نے مسلسل دس سال تک اپنا لہو پسینہ ایک کر کے اپنے اس دعوے کو دنیا سے منوایا کہ اسلام کی رو سے کسی ایک خطہ کے اندر بسنے والے تمام لوگ ایک قوم کے افراد نہیں ہوتے۔ مسلمان اپنی مخصوص آئیڈیلوجی کی بناء پر ایک الگ قوم ہیں اور غیر مسلم ایک دوسری قوم۔ نہ کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کو اپنا نمائندہ کہہ سکتا ہے۔ نہ مسلمان کسی غیر مسلم کو اپنی نیابت کا حق سونپ سکتا ہے۔ یہ دونوں مل کر نہ ایک مشترکہ حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ نہ ایک ہی قانون کے متبع ہو سکتے ہیں۔ اس لئے مسلمان اپنے آپ کو صرف اسی صورت میں آزاد کہہ سکتے ہیں۔ جب یہ اپنے تصورات کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنے کے قابل اس طرح ہو سکیں کہ کوئی دوسرا اس میں کسی قسم کا دخل نہ دے سکے۔ دس سال کی مسلسل جدوجہد اور شبانہ روز کی پیہم تگ و تاز کے بعد انہوں نے اپنے اس دعوے کو منوایا اور ہندوستان کو تقسیم کرا کر اس خطہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس کے بعد یہ نو سال تک اس کوشش میں رہے کہ اپنے ان مخصوص تصورات کو ایک منضبط آئین کی شکل دے سکیں۔ بہت سی الجھنوں کے بعد اس قوم کے نمائندے اکتوبر کے دوسرے ہفتے ڈھاکہ میں جمع ہوئے۔ اور وہاں انہوں نے بقائمی حواس خمسہ

وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

یہ قانون پاس کر دیا کہ مشرقی پاکستان کے باشندے مخلوط انتخاب کے ذریعہ اپنے نمائندے منتخب کریں گے یعنی مسلمان غیر مسلموں کو اپنا نمائندہ قرار دے سکیں گے اور غیر مسلم مسلمانوں کو ووٹ دے کر کامیاب بنا سکیں گے یوں اس بڑھیا نے قریب بیس سال میں جو کچھ کاتا تھا۔ اسے خود اپنے ہاتھوں "بوڑھی گنگا" میں جا کر بہا دیا۔ اور یہی نہیں کہ اسے خاموشی سے جا کر دریا کے سپرد کر دیا بلکہ ساری دنیا کو ببانگ دہل یہ بتا کر ایسا کیا کہ ہم جو ہندوستان میں چلا چلا کر کہا کرتے تھے کہ ہمارے

مذہب کی رُو سے مسلم اور غیر مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں، وہ محض اپنی جداگانہ مملکت قائم کرانے کے لئے ایک حربہ تھا جس دن ہماری مملکت قائم ہوگئی، وہ حربہ بھی ختم ہوگیا۔ باقی رہا جداگانہ انتخاب کا سوال۔ سو وہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک تدبیر تھی۔ جب ہمارے جملہ حقوق محفوظ ہوگئے تو اس تدبیر کی بھی ضرورت باقی نہ رہی۔ خدا اور رسول اور دین و قرآن کا نام ایک پردہ تھی جسے ہم نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے آگے بڑھا رکھا تھا۔ جب وہ مقاصد حاصل ہوگئے، پردہ کو الگ کر دیا۔ اب ہمیں یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر ایک قوم کی حیثیت سے جینا اور ایک قوم کی حیثیت سے مرنا چاہیئے۔ ایک ملک میں کہیں دو قومیں بھی ہوا کرتی ہیں؟ قومیں وطن کے اشتراک سے بنتی ہیں۔ مذہب کے اشتراک سے نہیں۔ مذہب کو سیاست سے واسطہ کیا؟ وہ وقت دور نہیں جب ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذہبی اختلافات کو فراموش کر کے، ایک قوم کے قالب میں ڈھل جائیں گے۔ اس وقت نہ ہندو، ہندو رہے گا نہ مسلمان مسلمان۔ سب پاکستانی بن جائیں گے۔

مسلم لیگیوں کی طرف سے بھی

ان بلند آہنگ اعلانات اور مقدس جذبات کے ساتھ اس بڑھیا نے اپنے سوت کے ٹکڑے ٹکڑے کئے۔ اور آپ حیران ہوں گے کہ یہ اعلانات مخلوط انتخاب کے حامیوں کی طرف سے ہی نہیں ہوئے بلکہ خود مسلم لیگ کے نمائندہ (میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ) نے بھی، جو جداگانہ انتخاب کی مدافعت کے لئے اٹھے تھے، فرمایا کہ

> مجھے اس سے اتفاق ہے کہ انتخاب کا مسئلہ ایسا نہیں جس کا تعلق مذہب یا عقیدہ سے ہو۔ میرے نزدیک یہ پاکستان کی رُوح کے تحفظ کے لئے ایک ہتھیار ہے اور جب یہ روح مستحکم ہو جائیگی تو پھر یہ ہتھیار بے کار ہو جائے گا۔ (ڈان مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء)

اس میں شبہ نہیں کہ مغرب کی میکیاولی سیاست میں اسے نہ عیب گنا جا سکتا ہے نہ جرم کہ آپ کل کیا کہتے تھے۔ اور آج کیا کہہ رہے ہیں۔ وہاں سیاسیات میں نہ کسی اصول کی پرواہ کی جاتی ہے نہ آئین کی۔ نہ کسی قول کا خیال رکھا جاتا ہے نہ اقرار کا۔ نہ وعدہ کا احترام کوئی حیثیت رکھتا ہے نہ معاہدہ کا پاس۔ مصلحت وقت کا جو تقاضا ہو وہ کہہ دیجئے اور جب جی چاہے اس سے مکر جایئے۔ وہاں کی سیاسی پالیسی کا اصل الاصول (میکیاولی کے پرستار، فریڈرک دوم کے الفاظ میں) یہ ہے کہ

میکیاولی سیاست

> کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ تم اپنے عزائم کو چھپاؤ۔ اور اپنے کیریکٹر کو ہمیشہ زیر نقاب رکھو۔ صحیح حکمت عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمت عملی یہ ہے کہ حسب موقع جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے اختیار کر لی جائے۔
>
> (بحوالہ "انسان نے کیا سوچا" صفحہ ۱۹۶)

لیکن کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ آٹھ دس کروڑ انسانوں پر مشتمل یہ قوم جس نے قرآن اٹھا اٹھا کر دنیا سے کہا تھا کہ ہمارا مطالبہ ہمارے

ایمان پر مبنی ہے۔ جس کے نمائندہ (قائد اعظم مرحوم) نے جناب گاندھی کو کھلے کھلے الفاظ میں لکھا تھا کہ

قائد اعظم کا اعلان

اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکا ہے۔ نہ شک و شبہ۔ کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ایک ملک ہے۔ یہ برصغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے۔ سیاست ہے یا عمرانی اصلاح ہے۔ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ ......

...... (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں) آج انسانی سعی و عمل کا دائرہ ایک ناقابل تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی۔ معاشی۔ سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے جس مذہب کو نوع انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر عمل کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں۔

(جناح کا خط بنام گاندھی۔ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء)[1]

کیا ہم سمجھ لیں کہ یہ ساری قوم اور اس کا یہ نمائندہ دس سال تک جھوٹ بول کر دنیا کو فریب دیتے رہے ہیں؟ کیا ہم سمجھ لیں کہ وہ

اقبالؒ

مرد مومن جس نے قوم کو پاکستان کا تصور دیا۔ جس نے سنہ ۱۹۰۸ء میں کہا کہ

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اور جس نے "وطنیت" کے بت کو "غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی" کہہ کر مسلمان سے پورے جوش و خروش سے کہا کہ

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے　　اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

---

[1] ان دنوں بعض لوگوں کی طرف سے قائد اعظم کی اگست سنہ ۱۹۴۷ء کی ایک تقریر کے بعض اقتباس یہ ثابت کرنے کیلئے پیش کئے جا رہے ہیں کہ وہ بھی متحدہ قومیت کے حامی تھے۔ اول تو قائد اعظم کا جو کیرکٹر ہمارے سامنے ہے اس سے یہ باور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا شخص دس سال تک مذہب کے نام پر دنیا کو دھوکہ دیتا رہا ہو اسلئے ان کی مجوزہ تقریر کا مفہوم ان کے سابقہ مسلک کی روشنی میں متعین کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر کوئی اس کے لئے بھی تیار نہ ہو تو ایسے باب میں ہمارا مسلک بالکل واضح ہے۔ ہمارے نزدیک دین کے معاملے میں سند نہ کوئی محمد علی جناح ہے نہ کوئی اقبال۔ سند ہے خدا کی کتاب۔ ہم قائد اعظم یا حکیم الامت کے کسی قول کو تائید میں پیش کرتے ہیں تو صرف اسلئے کہ ان کا وہ قول قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔ اگر انہوں نے کوئی ایسی بات کہی ہے جو قرآنی اصولوں کے خلاف ہے تو انہوں نے غلطی کی ہے۔ غلطی ہر انسان سے ہو سکتی ہے اسلئے دین کے معاملے میں سند کوئی انسان نہیں ہو سکتا صرف خدا کی کتاب ہو سکتی ہے جو غلطیوں سے مبرا ہے۔ وبذالک امرت وانا اول المسلمین۔

اور اسے بار بار سمجھایا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر	خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار	قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں	اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

کیا ہم سمجھ لیں کہ یہ ساری عمران دلائل و بصائر کو بطور سیاسی حربہ کے استعمال کرتا رہا؟ یہ وہی مردِ مومن تھا کہ جب اس کی زندگی کے آخری ایام میں (مولانا) حسین احمد صاحب مدنی نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں تو شدت احساس سے اس پر غشی کے دورے پڑنے لگ گئے اور اس نے کرب و الم کی انتہائی اذیت سے اپنے جذبات کا اظہار ان تین اشعار میں کیا جن کا دوام جریدۂ عالم پر ثبت ہے۔ یعنی

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ	زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است	چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست	اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اور جب مدنی صاحب نے اس پر بھی اپنے اس غیر قرآنی عقیدہ سے رجوع نہ کیا تو حضرت علامہ نے وہ بیان دیا جو ان کی زندگی کا آخری کارنامہ اور دنیا میں معرکۂ دین و وطن کے نام سے مشہور ہے۔ کیا ہم سمجھ لیں کہ یہ سب کچھ فریب ہی فریب تھا؟ کیا یہ سب سیاسی حربہ تھا؟ کوئی اور ایسا سمجھ سکتا ہے تو سمجھ لے لیکن طلوع اسلام تو ایسا کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے بھی کہ اس کے اُس دور کے ہزارہا صفحات میں کا ایک ایک صفحہ اسی معرکۂ دین و وطن کی زندہ شہادت ہے۔ جس میں اس کے مدمقابل ابوالکلام صاحب آزاد اور حسین احمد صاحب مدنی جیسے شہسوارانِ عرصۂ مذہب و سیاست تھے۔ آپ طلوع اسلام کے اس دور کا فائل اٹھایئے اور دیکھئے کہ اس میں اس دعوے کی تائید میں کتاب و سنت کی اسناد کے کس قدر عظیم انبار نظر آتے ہیں۔

ایک افسوسناک حقیقت

ہم سمجھتے تھے کہ جو مسائل تحریک پاکستان کے دوران میں اس قدر اہمیت رکھتے تھے تشکیل پاکستان کے بعد ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی۔ جیسے جب کوئی بندہ ایک عرصے کے غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد اسلام لے آئے تو اس کے بعد اسے اس قسم کے وعظ و نصیحت کی ضرورت نہیں رہتی کہ پیپل دیوتا نہیں ہوتا اور گھوڑے کی حیثیت ایک حیوان سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن مسئلۂ انتخاب کے سلسلہ میں پچھلے دنوں مختلف گوشوں سے جو کچھ سننے میں آیا۔ اس نے اس تاسف انگیز حقیقت کا انکشاف کیا کہ ہمارے نمائندگانِ ملت کے سامنے قرآنی سیاست کا تصور بالکل نہیں اور وہ اس کے بنیادی اصولوں تک سے بے خبر ہیں یا یوں کہیئے کہ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْعِجْلَ گوسالہ کی محبت ہمارے قلوب کی گہرائیوں میں اس طرح جاگزیں ہو چکی ہے کہ اس کا وہاں سے نکلنا آسان نہیں۔ اقبال کے الفاظ میں

ہزاراں سال منزل در مقامِ آذری کردہ — بخودکے می رسد ایں راہ پیمائے تن آسانے

اسمبلی سے باہر اور اس کے اندر مخلوط انتخاب کے حامی برابر دہراتے چلے گئے کہ ان مسائل کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور مخلوط انتخاب کسی طرح بھی اسلام کے منافی نہیں۔ ان کے مقابلہ میں جداگانہ انتخاب کے حامیوں میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ دیکھو! اس سوال کا اس طرح مذہب سے تعلق ہے اور مخلوط انتخاب یوں اسلام کے منافی ہے۔ نہ کسی کی زبان پر قرآن کی ایک آیت آئی۔ نہ کسی نے سنت رسول اللہؐ کا کوئی گوشہ اس کی تائید میں پیش کیا۔ کس قدر جگر سوز تھا یہ منظر کہ

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

حالانکہ مخالف اور موافق سب مسلمان تھے اور کم و بیش وہی حضرات جو دس سال تک تحریک پاکستان کے دوران میں جداگانہ انتخاب اور دو قومی نظریہ کو اسلام کا بنیادی تقاضا قرار دیتے رہے تھے۔

یہی وہ تلخ احساس ہے جس کی بنا پر ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ ـــــ دگر از سرگرفتم قصۂ زلف چلیپا را۔۔۔ یعنی ایک بار پھر اس حقیقت کو سامنے لایا جائے کہ ان مسائل کا دین سے کتنا گہرا تعلق ہے اور قرآن کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔

انسانوں کی تقسیم

دنیا میں جب سے انسانوں نے باہمی مل جل کر رہنے کی زندگی اختیار کی ہے انہوں نے اپنے آپ کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ شروع شروع میں انسان قبائلی زندگی بسر کرتا تھا۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے جدا۔ اور مختلف قبائل ایک دوسرے کے دشمن۔ ان میں باہمی لڑائیاں اور خونریزیاں ہوتی تھیں۔ قبائلی عصبیت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص اپنے قبیلہ کے کسی ایک فرد کو قتل کر دے تو اس کا جرم صرف اسی صورت میں معاف ہو سکتا تھا کہ وہ کسی دوسرے قبیلے کے دو آدمیوں کو جا کر قتل کر دے۔ قبائل پھیلے تو انہوں نے نسلی تقسیم کی شکل اختیار کر لی۔ منگولی نسل کے افراد آریائی نسل کے دشمن اور آریائی نسل کے لوگ سامی نسل کے خون کے پیاسے۔ یہی امتیازات آگے بڑھے تو انہوں نے وطنی تفریق کی صورت اختیار کر لی۔ ایک خطۂ زمین میں بسنے والے ایک قوم کے افراد اور دوسرے خطہ کے باشندے دوسری قوم کے لوگ۔ دریا کے اِس پار بسنے والے ایک قوم سے متعلق۔ اور اُس پار رہنے والے دوسری قوم کے افراد۔ اس تقسیم کو دورِ حاضر کی سیاسی اصطلاح میں نیشنلزم کہتے ہیں۔

نیشنلزم

اور یہی وہ نہج زندگی ہے جس تک انسان اپنی عقل کی رُو سے اس بیسویں صدی تک پہنچا ہے۔ اس تقسیم کا احساس کس جذبہ پر مبنی ہے اور نیشنلزم کی دیواریں کن بنیادوں پر استوار ہوتی ہیں، اس کے متعلق ہم سے نہیں بلکہ خود نیشنلزم کے پرستاروں کی زبان سے سنئے۔ پروفیسر کوبن اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILISATION) میں لکھتا ہے کہ

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت دیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے

حق استقلال و خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو
اپنے لئے خود مختاری کی مدعی ہوں ..... ان وجوہات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا
کہ کسی نظام حکومت کے لئے قومیت پرستی کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے۔ (ص ۱۶۶)

اسی قومیت پرستی کے ہاتھوں اس وقت دنیا کس قدر جہنم کے عذاب میں گرفتار ہے۔ یہ الگ جداگانہ موضوع ہے جسے ہم کسی دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں[1]۔ اس وقت صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ یہ ہے انسانوں کی تقسیم و تفریق کا وہ معیار جس تک انسان اپنی تنہا عقل کی رو سے اس وقت تک پہنچا ہے۔

قرآن کی تعلیم

لیکن وحیٔ خداوندی نے کہا کہ یہ معیار یکسر غلط اور وجۂ تذلیل انسانیت ہے۔ اس نے کہا کہ یہ چیز کہ ایک شخص کس ماں باپ کے گھر میں پیدا ہو گیا اور اس نے کس سرزمین میں جنم لے لیا، کوئی ایسا معیار نہیں جس کی بنا پر اُسے دوسری نسل یا دوسرے ملک کے انسانوں سے الگ قرار دے دیا جائے۔ یہ تقسیم تو خالص حیوانی سطحِ زندگی کی تقسیم ہے جسے انسانیت سے کچھ واسطہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے اعلان کیا کہ تمام دنیا کے انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں (کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً) اس لئے نسل یا وطن کی چار دیواریاں ان میں تفریق و تمیز پیدا نہیں کر سکتیں۔ ان میں تمیز پیدا کرے گی وہ چیز جو ایک انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسان سے ممتاز و متمیز کرتی ہے۔ مثلاً شریف انسان اور بدمعاش انسان ایک نہیں ہو سکتے۔ خواہ وہ ایک ہی باپ کے بیٹے کیوں نہ ہوں۔ جھوٹے اور سچے ایک گروہ کے افراد نہیں قرار دیئے جا سکتے خواہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد کیوں نہ ہوں۔ مجرم اور نیکوکار ایک جماعت سے متعلق نہیں سمجھے جا سکتے خواہ وہ ایک ہی زبان کیوں نہ بولتے ہوں۔ امن پسندوں اور قانون شکنوں کو ایک نہیں خیال کیا جا سکتا۔ خواہ وہ ایک ہی ملک میں کیوں نہ رہتے ہوں۔ ایک شریف انسان اور اس کا بدمعاش بیٹا حیوانی سطح پر (BIOLOGICALLY) باپ اور بیٹا کہلا سکتے ہیں۔ لیکن انسانیت کی سطح پر ان میں باہمی کوئی تعلق نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ تھا انسانوں میں باہمی تفریق و تقسیم کا وہ اصول جسے وحیٔ خداوندی نے عطا کیا۔ چنانچہ آپ قرآن میں دیکھئے۔ وہ کہیں (اسلامی نقطۂ نگاہ سے) عرب کی قوم یا ایران کی قوم، روم کی قوم یا یونان کی قوم کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ ذکر کرتا ہے قوم المجرمین اور قوم الفاسقین کا۔ قوم الظالمین اور قوم الکاذبین کا۔ جب وہ قوم المجرمین کہتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مجرم خواہ وہ دنیا کے کسی ملک میں بستے ہوں اور کسی خاندان، نسل یا قبیلہ سے متعلق ہوں وہ سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ انہی جزئیات کو سمٹا کر اس نے ایک عالمگیر کلیہ کے اندر سمو کر رکھ دیا۔ جب اس نے کہا کہ دنیا کے تمام وہ لوگ جو مستقل اقدار انسانیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہوں ایک قوم کے افراد ہیں اور تمام ایسے لوگ جو اس اصول سے

---

[1] جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ وہ اس اجمال کی تفصیل کے لئے ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "انسان نے کیا سوچا" کا مطالعہ فرمائیں۔

قرآنی معیارِ قومیت

انکار کریں، دوسری قوم کے افراد۔ پہلی چیز اس کی اصطلاح میں ایمان کہلاتی ہے۔ اور دوسری کو کفر (یعنی انکار) کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس نے تمام روئے زمین کے انسانوں کی تقسیم کا معیار کفر اور ایمان قرار دے دیا۔ مؤمن ایک قوم کے افراد اور غیر مؤمن دوسری قوم کے لوگ۔ یہی نوع انسانی کی وہ عالمگیر تقسیم ہے۔ جس کی طرف اس نے سورۂ تغابن کی دوسری آیت میں یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ (۶۴/۲)

اللہ وہ ہے جس نے تم سب انسانوں کو پیدا کیا۔ سو تم میں سے ایک گروہ نہ ماننے والوں (کافروں) کا ہے اور ایک گروہ ماننے والوں (مؤمنوں) کا۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں 'کافر' کا لفظ ایسے گھناؤنے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ یہ ایک طرح کی گالی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن نے اسے ان معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ اس نے اسے ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں ہم آج (NON-MEMBER) کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ کہتا ہے کہ دنیا کے وہ تمام انسان جو ان اقدار انسانیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں جو وحی کی رو سے ملے ہیں (اور جو اب قرآن کے اندر محفوظ ہیں) ایک گروہ۔ ایک جماعت۔ ایک قوم۔ ایک پارٹی کے ممبر ہیں۔ اور جو لوگ ان اقدار پر یقین نہیں رکھتے وہ اس پارٹی کے ممبر نہیں ہیں یعنی وہ (NON-MEMBER) کافر ہیں۔ بہرحال یہ ہے قرآن کی رو سے دنیا کے تمام انسانوں میں قومیت کی تقسیم کا معیار۔ اس کے نزدیک دنیا میں قومیں صرف دو ہیں۔ مومنین کی قوم اور غیر مومنین کی قوم۔ وہ کہتا ہے کہ یہی وہ دو قومیں ہیں جن میں شروع سے باہمی نزاع و پیکار چلی آرہی ہے چنانچہ جب وہ اس ضمن میں سب سے پہلی کشمکش کا ذکر کرتا ہے جو حضرت نوحؑ کے زمانے میں سامنے آئی تو وہ کہتا ہے کہ اس

ازل سے تا امروز

میں حضرت نوحؑ ایک طرف تھے اور ان کا حقیقی بیٹا دوسری طرف۔ جب حضرت نوحؑ اپنی "قوم" (جماعت مومنین) کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے لگے تو انھوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور کہا کہ ہمارے ساتھ آجا وَلَا تَكُنْ مَعَ الْكَافِرِينَ (۱۱/۴۲) اور تو کافروں کے گروہ کے ساتھ نہ رہ۔ لیکن جب وہ اپنی روش زندگی کو بدلنے پر آمادہ نہ ہوا تو حضرت نوحؑ کا ہم وطن ہونا تو ایک طرف ان کا بیٹا ہونا بھی اس کے کسی کام نہ آیا اور وہ اپنی پارٹی والوں کے ساتھ ہلاک ہوگیا۔ اور جب حضرت نوحؑ نے خیال کیا کہ وہ ان کے اپنے خاندان (اہل) میں سے تھا تو وحی خداوندی نے یہ کہہ کر اس کی صراحت کردی کہ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ (۱۱/۴۶) نہیں! وہ تیرے اہل میں سے نہیں تھا۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیمؑ کے باپ نے اس صحیح روش زندگی کو اختیار کرنے سے انکار کردیا تو آپؑ نے نہ صرف باپ سے بلکہ پوری قوم سے یہ کہہ کر قطع تعلق کرلیا وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ (۱۹/۴۸) میں تم سے اور جنھیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان سے کہدیا کہ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ہم تم سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو ان سب سے یکسر بے تعلق ہیں۔ كَفَرْنَا بِكُمْ ہم تم سے ہر رشتے

کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا۔ تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی کھلی عداوت اور نفرت رہے گی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو اور یہ عداوت محبت سے اور یہ نفرت رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر یقین کرو جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے حَتّٰى تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (۶۰/۴) اس لئے کہ اس عالمگیر اصولِ زندگی کی رُو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار خون یا وطن کا رشتہ نہیں۔ معیار یہ ہے کہ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ (۱۴/۳۶) جو شخص اس راستے میں میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے ہے۔ اور میرے "اپنے" جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے غیر ہیں۔ یہی تھا وہ معیار جس کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ بھی اپنوں میں سے نہیں بلکہ غیروں میں سے تھی۔ اس لئے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوا (۶۶/۱۰) قومیت کی تقسیم و تفریق کا یہی معیار تھا جو نوعِ انسانی کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا آیا تا آنکہ دنیا کے سامنے وہ دور آگیا جب وحی کی تکمیل ہو گئی۔ اور اس کے مطابق نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے ایک ایسی قوم کی تشکیل

قومِ رسولِ ہاشمی

ہوئی جس نے ساری دنیا پر روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کہ قومیت کا صحیح معیار کیا ہے۔ اس تشکیل قومیت کے مطابق حبش کا بلال۔ فارس کا سلمان۔ اور روم کا صہیب (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) محمد عربی کی اپنی قوم کے افراد تھے اور مکہ کا ابوجہل اور (حقیقی چچا) ابولہب غیر قوم کے افراد۔ قومیت کی اس تقسیم کا عملی مظاہرہ بدر کے میدان میں نکھر کر سامنے آگیا جب آسمان کی آنکھ نے یہ نظارہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے تو ان کا باپ عتبہ دوسری طرف۔ حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اُس طرف۔ حضرت علیؓ ادھر تھے تو ان کا بھائی عقیل اُدھر۔ نہیں! اور آگے بڑھیے ادھر خود محمدؐ تھے تو ان کے مدمقابل آپ کے حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص۔ یہ تھی وہ تقسیم انسانیت، جو وطن۔ رنگ، زبان نسل، رشتہ داری کے تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی۔ یہ تھی وہ امت محمدیہ۔ وہ ملت اسلامیہ۔ وہ جماعتِ مومنین جو دنیا کے مختلف حصوں کے ان انسانوں پر مشتمل تھی جن میں وجہ اشتراک صرف ایمان تھا یہی تھی وہ تقسیم جس کے متعلق کہہ دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۹/۷۱) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں اور ان کے مقابلہ میں نہ ماننے والوں (کفار) کی قوم بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۸/۷۳) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں۔ اس کے بعد اس قومِ مومنین کو تاکید کر دی کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ اے جماعتِ مومنین۔ تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔ اس لئے کہ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ۔ ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں الجھے ہو قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ۔ ان کے بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آجاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (۳/۱۱۸) ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے (تو زندگی

کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے) ان نہ ماننے والوں کی حالت یہ ہے کہ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ۔ اگر کوئی بات تمہاری بھلائی کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں سخت رنج پہنچتا ہے وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا (۳/۱۲۰) اور اگر تمہیں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز ان کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے۔[1]

یہ ہے قرآن کی تعلیم مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات کی بابت۔ پھر چونکہ یہ قوم (مومنین) خانقاہ نشین راہبوں کی جماعت یا تارک الدنیا زاہدوں کا گروہ نہیں تھی بلکہ وہ قوم تھی جس کے دین کے تمکن ESTABLISH ہونے کے لئے حکومت لاینفک تھی (دیکھئے ۲۴/۵۵) اس لئے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تم نے اپنی حکومت میں تمام فیصلے احکام خداوندی کے مطابق کرنے ہیں فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۹) جو ایسا نہیں کرتا وہ مومن نہیں، کافر ہے (۵/۴۴) قرآن کے ان اصولوں کی روشنی میں تمہیں جو قوانین مرتب کرنے پڑیں انہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشورے سے طے کیا کرو (وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۴۲/۳۸) ان میں کسی غیر کو شریک نہ کیا کرو۔ جو اس مستقل اقدار کی صداقت پر یقین ہی نہیں رکھتا وہ تمہارے امور مملکت میں شریک دخیل کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آپ کو نہ رسول اللہ کی مجلس شوریٰ میں کوئی غیر مومن دکھائی دے گا نہ خلفاء راشدین کی پارلیمان میں کوئی غیر مسلم۔ ان کی حکومت خالصۃً جماعت مومنین پر مشتمل تھی اور غیر مسلم اس میں ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سر پر تھی۔

یہ تھا وہ معیار قومیت اور نظام مملکت جو قرآن نے مسلمانوں کو دیا تھا اور اسی کے مطابق ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔[2] یہ مطالبہ ہمارے عقیدہ کی بنیاد پر تھا۔ ہمارے دین کا جزو تھا۔ نہ اس میں کسی سودا بازی کا سوال تھا۔ نہ مداہنت COMPROMISE کی کوئی گنجائش۔ دنیا سے ہماری ضد کہتی تھی۔ ہم اسے اپنا ایمان قرار دیتے تھے۔ اور یہی وہ ایمان تھا جس کی قوت سے ہم نے اپنا یہ مطالبہ دنیا سے منوالیا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم اپنے ان کرمفرماؤں سے پوچھتے ہیں جنہوں نے تنازعہ انتخاب کے سلسلہ میں اتنا کچھ کہا کہ کیا اب بھی اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ قرآن کی رو سے

(۱) غیر مسلم افراد مسلم قوم کا جزو نہیں بن سکتے۔

(۲) اس امر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی غیر مسلم مسلمان کو اپنا نمائندہ تجویز کرے یا مسلمان کسی غیر مسلم کو اپنا حق نیابت سونپ دے اور

(۳) ان تمام باتوں کا نہ صرف یہ کہ دین سے کچھ تعلق ہے بلکہ یہ امور دین کی اصل بنیاد ہیں۔ ان کے بغیر اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ اور اسلامی حکومت کے بغیر دین کا تمکن ناممکن ہے۔

---

[1] عدم گنجائش کے باعث یہاں صرف انہی آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید آیات کیلئے دیکھئے ۳/۳۷ ؛ ۴/۸۹ ؛ ۴/۱۳۹ ؛ ۴/۱۴۴ ؛ ۵/۵۵ ؛ ۹/۱۰ ؛ ۵۸/۲۲ ؛ ۶۰/۱

[2] اس اصول کے مطابق دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک قوم کے افراد ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم نے اس فراموش کردہ حقیقت کی تجدید کے لئے پہلے ایک خطہ کو منتخب کیا تاکہ اس خطہ میں اس حقیقت کو لباس مجاز میں لاکر دنیا کے باقی مسلمانوں کو بتایا جائے کہ دین کا مقصود یہ تھا۔ اب تم اسکی دعوت کو آگے پھیلاتے چلے جاؤ

اس کے بعد یہ سوچئے کہ ہمارا یہ فیصلہ کہ مملکت پاکستان کے کسی ایک حصہ میں بھی مسلم اور غیر مسلم ایک مشترکہ قوم کی حیثیت سے مخلوط انتخاب کے ذریعہ اپنے نمائندے منتخب کریں، قرآن کی رو سے کیسا ہے؟

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ مخلوط انتخاب کا فیصلہ یکسر قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے اور (اقبال کے الفاظ میں)

قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اس کا ذمہ دار کون ہے؟

لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آپ نے دیکھا ہے کہ اس مسئلہ پر ملک میں دو گروہ سامنے آ گئے ہیں ایک گروہ وہ ہے جس نے مخلوط انتخاب کے حق میں ووٹ دیا ہے (یعنی ریپبلکن پارٹی جس کی تائید کانگریس کر رہی ہے) دوسرا گروہ وہ ہے جو اسلام کا جھنڈا اٹھائے ایک متحدہ محاذ کی شکل میں اول الذکر گروہ کی مخالفت میں سامنے آ گیا ہے ان میں سب سے پیش پیش جماعت اسلامی ہے۔ یہ گروہ مشہور کر رہا ہے کہ اس غیر اسلامی فیصلہ کی ذمہ داری اول الذکر گروہ پر ہے اور ہم اسلام کے سچے محافظ ہیں لیکن اگر آپ ان حضرات کے اسلامی نعروں سے الگ ہٹ کر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ اس اسلام سوز قانون کے اولین ذمہ دار خود یہ حضرات ہیں جو اب اسلام کا درد سینے میں لئے یوں میدان میں اتر آئے ہیں۔ سطح بین نگاہوں کے لئے ہمارا یہ دعوےٰ تعجب انگیز ہوگا، لیکن جو حضرات سطح سے ذرا نیچے اتر کر دیکھیں گے ان کی صداقت واضح طور پر ان کے سامنے آ جائیگی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس دستور پاکستان کو جو ابھی چھ ماہ قبل اسمبلی میں پاس ہوا تھا عین اسلامی قرار دیکر ملک میں شادیانے بجائے اور اس دستور کے واضعین کو تبریک و تہنیت کے تار بھیجے تھے حالانکہ یہی وہ دستور ہے جس کے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت اور مخلوط انتخاب کے بیج موجود ہیں۔ ڈھاکہ میں جو کچھ ہوا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس تخم خبیث نے اپنی پہلی کونپل باہر نکالی ہے۔ ہمارے اس دستور کے اندر یہ شقیں موجود ہیں کہ

(۱) پاکستان کا انداز حکومت جمہوری (ڈیماکریٹک) ہوگا جس میں تمام باشندگان ملک (PEOPLE OF PAKISTAN) برابر کے شریک ہونگے

(۲) صوبائی مجالس مقننہ مسلم اور غیر مسلم اراکین پر مشتمل ہونگی اور ان مجالس میں تمام امور کے فیصلے ان اراکین کی کثرت رائے سے ہونگے۔

(۳) اسی طرح نیشنل اسمبلی بھی مسلم اور غیر مسلم اراکین پر مشتمل ہوگی اور قانون سازی کے امور میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔

(۴) صدر مملکت اگرچہ مسلمان ہوگا لیکن اس کا انتخاب نیشنل اسمبلی کے مسلم اور غیر مسلم ممبر مخلوط انتخاب کے ذریعے کریں گے۔

آپ سوچئے کہ جس دستور میں یہ شقیں موجود ہوں کیا اسے کسی طور پر بھی اسلامی قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور پھر غور کیجئے کہ کیا مخلوط انتخاب ان شقوں کا لازمی اور فطری نتیجہ نہیں؟ اور اسکے بعد اس پر غور کیجئے کہ اس دستور کو ان تمام مذہبی جماعتوں نے مل کر اسلامی دستور قرار دیا تھا جو آج مخلوط انتخاب کے خلاف متحدہ محاذ بنا رہی ہیں آپ طلوع اسلام کے مارچ اور مئی ۱۹۵۶ء کے پرچے اٹھا کر دیکھئے کہ ہم کس طرح پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ یہ سب شقیں غیر اسلامی ہیں اس سے متحدہ قومیت اور مخلوط انتخاب کے دروازے کھل رہے ہیں خدا کے لئے اس دستور کو اسلامی قرار دیکر عوام کو فریب نہ دو، اسلام اور پاکستان کو تباہ نہ کرو۔ لیکن ان علمبرداران شریعت نے یہاں تک دہاں تک شور مچانے رکھا کہ طلوع اسلام ملحد بے دین ہے اس کی بات کوئی نہ سنے۔ اب آپ دیکھ لیجئے کہ کس طرح حرفاً حرفاً وہی کچھ سامنے آ رہا ہے جو یہ ملحد بے دین کہتا تھا مسلہ

طلوع اسلام نے کیا کہا تھا؟

لہ یہ الفاظ خیر سے اس "قرارداد مقاصد" میں ہیں جو آپ کے اسلامی دستور کی بنیاد ہے۔

انتخاب کے متعلق ہم نے اس وقت لکھا تھا کہ

انتخاب کا مسئلہ ویسے کا ویسا ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ برسرِاقتدار پارٹی کا (مشرقی بنگال کے عنصر کو چھوڑ کر) یہ خیال ہے کہ انتخابات جداگانہ ہونے چاہئیں۔ ان کا یہ موقف اسلام کی تعلیم پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جداگانہ انتخاب اسلامی تعلیم کی رُو کا تقاضا ہے لیکن اگر اس پارٹی کے موقف کو من حیث الکل دیکھا جائے تو بڑی متناقض صورت سامنے آتی ہے۔ جداگانہ انتخاب کی تائید میں ان کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کی رُو سے یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہندو مسلمانوں کے نمائندہ کے انتخاب میں حصہ لے سکے! بجا اور درست۔ لیکن اسی پارٹی نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ مجالس مقننہ صدر مملکت کا انتخاب کریں گی جو بہرحال مسلمان ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ ان مجالس میں ہندو اور دیگر غیر مسلم اراکین بھی ہوں گے۔ بنا بریں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک غیر مسلم مسلمان صدر مملکت کے انتخاب میں حصہ لے سکتا ہے تو وہ ایک مسلم رکن (ممبر) کے انتخاب میں کیوں حصہ نہیں لے سکتا۔ نیز اگر غیر مسلم اراکین قرآن و سنت کے مطابق قوانین مرتب کرنے کے کام میں شریک ہو سکتے ہیں تو وہ مسلمان نمائندوں کے انتخاب میں کیوں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ ہیں وہ سوالات جو برسرِاقتدار پارٹی کے موقف کی کمزوری کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ بنا بریں معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ

(۱) اگر غیر مسلم اراکین مسلمان صدر ریاست کے انتخاب اور اسلامی قوانین کی ترتیب و تدوین میں حصہ لینے کے مجاز ہیں تو انہیں مسلمان نمائندے چننے کے لئے بھی مجاز قرار دینا چاہیئے۔ یعنی انتخابات مخلوط ہونے چاہئیں۔ (۲) اور اگر ایک غیر مسلم کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ کسی مسلمان نمائندے کے انتخاب میں حصہ لے سکے تو اس کی بھی اجازت نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ مسلم صدر ریاست کے انتخاب یا اسلامی قوانین کی تدوین کے کام میں حصہ لے سکے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں ہمارے نزدیک دوسری صورت ہی اسلامی تعلیم کی منشاء کے مطابق ہے۔ برسرِاقتدار پارٹی کا ——— سنگ بے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن ——— کا مسلک نہ اسلامی تعلیم کے مطابق ہے اور نہ معقولیت پر مبنی۔ آپ حیران ہوں گے کہ اتنے اہم مسئلہ کے متعلق ہمارے علمائے کرام کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلا۔ وہ (برسرِاقتدار پارٹی کی ہمنوائی میں) جداگانہ انتخاب پر تو زور دے رہے ہیں لیکن ایک ایسے فیصلہ کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں کرتے کہ غیر مسلم اراکین مسلم صدر ریاست کے انتخاب اور اسلامی قوانین کی تدوین میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اس وقت ان کی ساری کی ساری [illegible] میں صرف ہو رہی ہیں کہ برسرِاقتدار پارٹی نے جو مسودہ مرتب کر دیا ہے اسے منظور کر لیا جائے۔ حالانکہ اس میں کئی ایک دفعات ایسی ہیں جنہیں یہ حضرات خود غیر اسلامی قرار دیا کرتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کے خلاف بھی ان کی طرف سے اعتراض نہیں ہوا! اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ جب ان صاحبان کے لئے آئین میں اس قسم کی ضمانتیں موجود ہوں کہ زکوٰۃ اور اوقاف کا روپیہ مذہبی امور پر صرف کیا جائے گا۔ اسلامیات کے متعلق ایک ادارہ قائم کیا جائے گا جس کے لئے عوام پر خصوصی ٹیکس لگایا جائے گا۔ قانون سازی کے سلسلہ میں ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو اسلامی احکام کی فہرستیں مرتب کرے گا۔ تو پھر اس آئین کی کسی شق کو قرآن و سنت کے خلاف قرار دینا سراسر حماقت ہے۔ اس سے یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں آ جائے گی کہ مسلمانوں کی تاریخ میں غیر اسلامی قوانین و احکام کس طرح عین مطابق اسلام قرار پا جایا کرتے تھے! [طلوع اسلام مارچ ۱۹۵۶ء]

ایک اسلامی مملکت کی مجالس مقننہ میں غیر مسلموں کی پوزیشن کے متعلق ہم نے مئی ۱۹۵۶ء کے طلوع اسلام میں لکھا تھا۔

غیر مسلموں کی پوزیشن

شق ۱۵۰ میں درج ہے کہ مجلس مقننہ کا رکن ہر فرد مملکت ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت کی مجلس مقننہ میں غیر مسلموں کو شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا جواب بڑا آسان ہے۔ اسلامی مملکت میں مجلس مقننہ کا فریضہ یہ ہوتا ہے (اور اس کی صراحت خود ہمارے دستور میں موجود ہے) کہ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے (یا ہمارے دستور کے الفاظ میں قرآن و سنت کے مطابق) قوانین مرتب کرے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک غیر مسلم ملت اسلامیہ کے لئے حدود اللہ (قرآن و سنت) کی روشنی میں کس طرح قانون مرتب کر سکتا یا ایسے قوانین کی تدوین میں شریک ہو سکتا ہے! یہی وجہ ہے کہ قرآن انہیں شریکِ مملکت نہیں کرتا بلکہ اس حقیقت سے کہ وہ اسلامی نظام و مسلک کی صداقت کے معترف نہیں ہوتے انہیں شریکِ راز کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا ایک غیر مسلم اسلامی مملکت کی مجلس مقننہ (اور اجرائیہ) کا رکن کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہاں! مملکت کے غیر مسلم باشندے ان مجالس کے انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں۔ بعض [illegible] آج کل تو اکثر طبائع کو یہ چیز بڑی ناگوار گزرے گی اور وہ اسے انتہائی تنگ نظری پر محمول کریں گے اور اسے جمہوریت

کے خلاف قرار دیئے گئے۔ سو پہلی چیز تو یہ ہے کہ دین کے معاملے میں ہماری ناگواری یا خوش آئندی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ دین کے اصول اٹل ہیں، اور وہ کسی کی ناگواری کی بنا پر بدلے نہیں جا سکتے۔ لہٰذا اس سوال کو اس پہلو سے دیکھنا چاہیئے کہ کیا قرآن کا اس باب میں یہی فیصلہ ہے۔ اگر اس کا یہی فیصلہ ہے تو مسلمان کا شیوہ اس فیصلہ کے سامنے سر جھکا دینا ہوگا، خواہ اس کے ذاتی رجحانات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن کا فیصلہ اس باب میں بالکل واضح ہے اور اس میں دو آراء کی گنجائش ہی نہیں۔ لہٰذا بات بالکل صاف ہے لیکن اس کے باوجود مقام حیرت ہے کہ قرآن کے ایسے کھلے ہوئے فیصلے کی موجودگی میں یہ آئین ان لوگوں نے پاس کر دیا ہے جو اپنی مجلس کا آغاز بھی قرآنی آیات سے کیا کرتے تھے اور جنہوں نے خیر و برکت کی دعائیں بھی قرآنی آیات ہی کے الفاظ میں مانگی تھیں اور اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز یہ کہ ملک کے ارباب مذہب میں سے کسی نے بھی اس کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا حالانکہ ان میں سے اکثر اس سے پیشتر اپنی تحریروں اور تقریروں میں اسے اسلام کے خلاف قرار دیا کرتے تھے (طلوع اسلام بابت مئی ۱۹۵۶ء)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ مخلوط انتخاب کس طرح ان شقوں کا لازمی نتیجہ تھا جنہیں ہمارے ارباب شریعت نے اس وقت عین اسلامی قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ محترم وزیر اعظم (مسٹر سہروردی) نے یہی دلیل مخلوط انتخاب کے حق میں دی اور پوچھا کہ اگر دستور پاکستان کی یہ شقیں عین اسلامی ہیں تو مخلوط انتخاب کس طرح غیر اسلامی ہو؟ اس کے جواب میں محترم مودودی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ (اردو زبان کے محاورے میں) کھمبا نوچنے سے زیادہ کچھ نہیں۔ سہروردی صاحب نے کہا کہ ہمارے ہاں میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مخلوط انتخاب

مودودی صاحب کے جوابات

مدت سے چلا آرہا ہے اسے ان ارباب شریعت نے کبھی غیر اسلامی قرار نہیں دیا۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ادارے قومی آئیڈیالوجی، نہج زندگی اور خارجی و داخلی مسائل پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوتے جس طرح صوبائی یا قومی مجالس اثر انداز ہوتی ہیں (ڈان - ۲۰ اکتوبر)

گویا انتخاب کے معاملہ میں سوال کسی اصول کا نہیں صرف اثر اندازی کا ہے یعنی یہ نہیں کہ مخلوط انتخاب بجائے خویش اسلامی اصول کے خلاف ہے بلکہ یہ کہ جہاں اس کا اثر خراب پڑے وہاں یہ ناجائز ہے اور جہاں اس کا اثر ایسا خراب مرتب نہ ہو وہاں اس کا کچھ مضائقہ نہیں! بالفاظ دیگر لحم خنزیر بذات خویش حرام نہیں جہاں اس کے کھانے سے خراب اثرات مرتب ہوں وہاں یہ ناجائز ہوگا اور جہاں ایسے نتائج پیدا نہ ہوں وہاں اس کے استعمال میں کچھ مضائقہ نہیں ہوگا! یا للعجب۔

اس کے بعد مسٹر سہروردی نے کہا کہ جب مجلس مقننہ کے مسلم اور غیر مسلم اراکین مخلوط انتخاب کے ذریعے صدر ریاست کو منتخب کر سکتے ہیں اور یہ طریق عین اسلامی ہے تو پھر ایک معمولی رکن کو مخلوط انتخاب کے ذریعہ منتخب کرنا کس طرح غیر اسلامی ہو جائیگا؟ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ قابل غور ہے۔ انہوں نے کہا کہ

صدر ریاست کی ایک ہی تو اسامی ہے اس لئے یہیں جداگانہ یا مخلوط انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے مجلس مقننہ کی نشستوں کیلئے بطور نظیر پیش نہیں کرنا چاہیئے

ملاحظہ فرما لیا آپ نے جواب! یعنی اگر ایک بکرا ہو تو اس کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اسے اللہ کا نام لیکر ذبح کیا جائے یا غیر اللہ کے نام سے۔ البتہ اگر دس بیس بکرے ہوں تو پھر یہ سوال ضرور سامنے آئے گا!

پھر مسٹر سہروردی نے کہا کہ مسلمانوں کی دیگر مملکتوں میں مخلوط انتخاب رائج ہے کیا وہ سب غیر اسلامی طریق اختیار کئے ہوئے ہیں؟ اس کا صاف جواب تھا کہ بیشک وہ غیر اسلامی طریق اختیار کئے ہوئے ہیں بلکہ ان میں بیشتر ایسی ہیں جہاں ابھی تک ملوکیت (وراثتی بادشاہت) مروج ہے جو اسلام کی جڑ اور بنیاد کے خلاف ہے لیکن مودودی صاحب نے یہ کہنے کے بجائے کہ وہ ریاستیں مثالی اسلامی ریاستیں نہیں، فرمایا کہ

وہاں مسلمان غالب اکثریت میں ہیں اور وہاں کی غیر مسلم آبادی کا طرز عمل بھارت کے ہندوؤں جیسا نہیں

یعنی سوال پھر اصول کا نہیں، اثرات و نتائج کا ہے۔ اگر بھارت کے ہندوؤں کا طرز عمل خوشگوار ہوتا تو ہم یہاں مخلوط انتخاب رائج کر سکتے تھے لیکن چونکہ ان کا طرز عمل ناخوش آئند ہے اس لئے یہاں جداگانہ انتخاب ہونا چاہیئے۔ یہ ہے ہمارے دین کے علمبرداروں کی نہج فکر! ان سے کوئی پوچھے کہ کیا پاکستان میں بھی مسلمانوں کی اسی طرح غالب اکثریت نہیں جس طرح دوسرے مسلم ممالک میں ہے؟

مسٹر سہروردی کے اس سوال کے جواب میں کہ انتخاب کے مسئلہ کو مذہب سے کیا تعلق، مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

مجالس مقننہ میں اس امر کے فیصلے ہوں گے کہ قرآنی احکام کو کس طرح نافذ العمل کیا جائے۔ اب فرمائیے کہ اس مقصد کے لئے مسلمان اپنے نمائندے چنیں گے۔ غیر مسلم بھی اس چناؤ میں حصہ لیں گے۔ غیر مسلم اس کا فیصلہ کس طرح کر سکتے ہیں کہ قرآنی احکام کے نفاذ کیلئے کونسا امیدوار زیادہ موزوں ہے؟

بجا اور درست، غیر مسلم اس کا فیصلہ واقعی نہیں کر سکتے کہ اسلامی احکام کے نفاذ کیلئے کونسا ممبر زیادہ موزوں ہو سکتا ہے لیکن وہ (آپ کے اسلامی دستور پاکستان کے مطابق) اس کا فیصلہ ضرور کر سکتے ہیں کہ فلاں قانون اسلامی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ جبھی تو انہیں یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ قانون سازی کے امور میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں اور جب وہ آئین شریک ہو سکتے ہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض امور کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے آخری فیصلے کا انحصار انہی غیر مسلم ممبروں کے ووٹ پر ہو کیونکہ جیسا کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے جب مسلمان ممبروں کے ووٹ بٹ جاتے ہیں تو فیصلہ کن ووٹ اکثر غیر مسلموں کے ہوتے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ دستور میں یہ شق موجود ہے کہ ہمارا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا اس لئے غیر مسلم اراکین کے ووٹ اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اگر یہی دلیل ہے تو پھر اس کے مطابق وہ مسلم ممبر بھی ان باتوں پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گے جنہیں غیر مسلم مخلوط انتخاب کے ذریعے منتخب کر کے بھیجیں گے پھر آپ کو مخلوط انتخاب پر اعتراض کیا ہے؟

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کے یہ جوابات کس قدر رکیک اور بودے ہیں۔ یہ سب اس لئے کہ انہوں نے اس دستور کو اسلامی قرار دے رکھا ہے جس میں یہ تمام غیر اسلامی شقیں موجود ہیں اور جن کا لازمی نتیجہ مخلوط انتخاب اور متحدہ قومیت ہے اور اب ان میں اس اعتراف کی جرأت نہیں کہ دستور واقعی غیر اسلامی ہے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مخلوط انتخاب کے فیصلہ کے حقیقی ذمہ دار کون لوگ ہیں۔ اس کے اولیں ذمہ دار تو یہی حضرات ہیں جو آج بڑھ چڑھ کر مخلوط انتخاب کی مخالفت کر رہے ہیں۔ مخلوط انتخاب کو روکنے کا وقت وہ تھا جب یہ غیر اسلامی دستور مرتب ہو رہا تھا۔ اس لئے اگر قوم کو کسی کے خلاف محاذ قائم کرنا ہے تو وہ محاذ سب سے پہلے ان لوگوں کے خلاف ہونا چاہیے جنہوں نے اس قسم کے دستور کو عین اسلامی قرار دے کر مخلوط انتخاب اور متحدہ قومیت کے دروازے کھول دیئے اور اس اسلامک آئیڈیالوجی کو تباہ کر کے رکھ دیا جس کی بنیادوں پر پاکستان کا مطالبہ اور وجود عمل میں آیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے عوام اس قدر سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ وہ بہت جلد پراپیگنڈے کے اثر میں آ جاتے ہیں اور یہ جانتے ہی نہیں کہ مقدس نقابوں کی آڑ میں اسلام اور پاکستان کے خلاف کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ مودودی صاحب اور ان کی جماعت دس سال تک تحریک پاکستان کی مخالفت کرتی اور اسے غیر اسلامی قرار دیتی رہی یہ اعلان کرتے ہوئے کہ

> پاکستان کی اسکیم ان لوگوں کے دماغ کی پیداوار ہے جن کے ذہن کی ساری تربیت مغربی اثرات کے ماتحت ہوئی ہے۔ اور جنہوں نے تمدن و سیاست کے متعلق تمام تصورات یورپ کی تاریخ اور علوم عمران سے سیکھے ہیں۔[1]

(اس نقطہ کو فراموش نہ کیجئے کہ پاکستان کی اسکیم علامہ اقبال کے دماغ کی پیداوار تھی) وہ برملا کہتے تھے کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں مسلمان جہاں جہاں کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔

لیکن ان کی اس ساری مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آ گیا۔ سائیکولوجی کے طالب علم جانتے ہیں کہ جو لوگ ان جذبات کے ساتھ پاکستان آئے ہوں وہ پاکستان کے کبھی حقیقی طور پر بہی خواہ ہو سکتے ہیں؟ ان حضرات کے سامنے صرف اپنے مفاد ہیں۔ یہ آئندہ الیکشن کے لئے عوام میں مقبول ہونا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے پہلے اس قسم کے آئین کو اسلامی قرار دے کر مقبولِ عام کا تمغہ حاصل کر لیا (کہ یہ ہے وہ جماعت جس نے ملک کو اسلامی آئین دلایا ہے) اور اب (جب اس آئین کے برگ و بار سامنے آنے لگے) تو مخلوط انتخاب کی مخالفت کے لئے مجاہد بن کر سامنے آ گئے۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ مخلوط انتخاب کے فیصلے میں وہ حضرات جو اب اس کے حق میں ہیں اور وہ جو اس کی مخالفت کر رہے ہیں، دونوں برابر کے شریک ہیں اور یہ کوئی الگ تھلگ مسئلہ نہیں بلکہ اس کی اصل و بنیاد دستور پاکستان کے اندر موجود ہے۔ لہٰذا قوم کیلئے کرنے کا کام یہ ہے کہ دستور پاکستان کو از سر نو صحیح اسلامی خطوط کے

کرنے کا کام | مطابق مرتب کریں۔ اس دستور کے مطابق اسلامی مملکت پاکستانیہ کی پارلیمان اور دیگر مجالس مقننہ خالص مسلمانوں پر مشتمل ہوں گی اور غیر مسلم ان پ

[1] دیکھئے سیاسی کشمکش حصہ سوم

ڈیل کار نہیں ہو سکیں گے۔ پاکستان میں ایک ہی قوم ہو گی جسے ملتِ اسلامیہ کہا جائیگا اور غیر مسلم ہمیشہ اس میں صرف اقلیت کی حیثیت سے رہینگے۔ اس اقلیت کے جان مال عزت آبرو معابد کی حفاظت مملکت پاکستان کا اولین فریضہ ہوگا اور انھیں اپنے دائرہ کے اندر اپنے مذہب پرسنل لاء اور ثقافت کی آزادی ہو گی۔

کہا جائیگا کہ (۱) یہ تو بڑی تنگ نظری کی بات ہے (۲) اس دورِ جمہوریت میں مملکت کی آبادی کے ایک حصہ کو اس پوزیشن میں رکھنا بڑی زیادتی ہے نیز یہ بھی کہ (۳) اگر ہم نے غیر مسلموں کو اپنی قوم کا جزو تسلیم نہ کیا تو وہ پاکستان میں جداگانہ ریاست کا مطالبہ پیش کر دینگے۔ وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک تنگ نظری کا سوال ہے ہم نے مئی ۱۹۵۶ء کے طلوعِ اسلام میں لکھا تھا کہ

اسلام کا نام کیوں لیتے ہو؟

> باقی رہا تنگ نظری کا طعن سو مغرب کی ذہنیت کے معیار کے مطابق تو اس زمانے میں کسی مملکت کا مذہب کی بنیادوں پر قائم ہونے کا دعویٰ ہی بزرگ تنگ نظری کی ایک تنگ نظری ہے۔ لہٰذا اگر تنگ نظری کے طعن سے بچنا ہے تو مملکت کے معاملے میں اسلام کا نام لینا بند کر دو۔ جس طرح دنیا کی کشادہ نظر قومیں اپنے سیاسی معاملات کا حل سوچتی ہیں اسی طرح آپ بھی کریں۔ پھر یہ خدا اور رسول کیسا اور کتاب و سنت کیا؟

جمہوریت

دوسری بات ہے آئینِ جمہوریت کی۔ سو ہم جیسا کہ شروع میں لکھ چکے ہیں اسلام میں جمہوریت کا تصور بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح حدود اللہ کی پابندی سے شروع ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کوئی جمہوریت قابلِ قبول نہیں ہو سکتی اگر وہ حدود اللہ سے ٹکراتی ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت کی مجلسِ مقننہ کی ترتیب و تشکیل کا جو تصور اوپر بیان کیا گیا ہے وہ اسلامی جمہوریت کے عین مطابق ہے اگر وہ مغربی جمہوریت کے خلاف ہے تو ہوا کرے ہم نے پاکستان اسلامی جمہوریت کے قیام کیلئے حاصل کیا ہے نہ کہ مغربی جمہوریت کے لئے۔ اگر ہمارے نزدیک مغربی جمہوریت ہی قابلِ قبول ہوتی تو ہمیں ہندوستان سے کٹ کر الگ مملکت بننے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

بات بالکل واضح ہے اگر آپ کا ایمان ہے کہ ہمارے لئے اسلامی نظام ہی صحیح نظامِ مملکت ہو سکتا ہے تو پھر اسے ساری دنیا کے علی الاعلان اختیار کیجئے اور اگر آپ اس میں جھجک محسوس کرتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آج کے دور میں ناممکن العمل ہے تو پھر نہایت دیانتداری سے اس کا اعلان کیجئے اور باقی اقوامِ عالم کی طرح یہاں سیکولر اسٹیٹ قائم کیجئے۔ اسلامی حکومت کے متعلق قائداعظم کے یہ الفاظ ہمیشہ سامنے رکھیے کہ

> ایسی اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی مملکت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے
>
> (حیدرآباد دکن میں ۱۹۴۱ء میں نوجوانوں سے ایک انٹرویو)

اور غیر مسلموں کے متعلق قرآن کا جو فیصلہ ہے وہ سابقہ صفحات میں سامنے آ چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ جب بھی آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر قومیت اور مملکت کی تشکیل کرینگے اس میں وہ لوگ جو اس آئیڈیالوجی پر یقین نہیں رکھتے کبھی برابر کے شریک قرار نہیں دیئے جا سکیں گے (روس کی مثال آپ کے سامنے ہے) اور آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے ہم دنیا کے سامنے شرمائیں۔ یہ تو وہ اصول ہے جس پر ہمیں فخر کرنا چاہیئے۔ اب تو مغرب کے سیاسی اور عمرانی مفکر بھی اس عیاں نکتہ تک پہنچ رہے ہیں کہ اسلام نے قومیت کی بنیاد جو آئیڈیالوجی پر رکھی تھی۔ انسانیت کی فلاح اسی میں ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے "انسان نے کیا سوچا"؛ حصہ سیاسیات) لہٰذا آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کا تصور ہے ندامت نہیں ہونا چاہیئے۔

شرمانے کی بات نہیں

ہم نے پاکستان کا خطہ اسی مقصد کیلئے حاصل کیا ہے کہ یہاں سے اس تصور کی ابتدا کی جائے اور اسکے بعد اس چاردیواری کے پیچھے سرکتے سرکتے اسے پوری دنیا پر محیط کر دیا جائے۔ لیکن آپ ہیں کہ ایسے بلند نصب العین سے شرما کر ذہنیت کی تنگ نظری کے تصور کو فخریہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (۷/۱۷۶)۔ ہم چاہتے تھے کہ انھیں آسمان کی بلندیوں تک لے جائیں لیکن یہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹے چلے جا رہے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اس طرح ہندو ایک جداگانہ ریاست کا مطالبہ پیش کر دینگے۔ سو یہ سوال بڑا ہی تعجب انگیز ہے۔ ہم تحریک پاکستان کے دوران میں دس برس تک بانگ دہل کہتے رہے کہ ہمارے دین کے تصور کے مطابق غیر مسلم ہماری قوم کا جزو نہیں بن سکتے۔ ہم مملکت کے بارے میں بھی ایک جداگانہ تصور رکھتے ہیں اس مملکت میں غیر مسلم ایک اقلیت کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں اور اقلیتوں کی ہمارے ہاں یہ پوزیشن ہوگی اور یہ حقوق۔ ان اعلانات کے بعد پاکستان وجود میں آیا۔ اب ظاہر ہے کہ جن غیر مسلموں نے اس کے باوجود پاکستان میں رہنا پسند کیا انھوں نے سب کچھ سمجھتے سوچتے ہوئے ایسا کیا۔ سو اب انھیں اس کا کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ریاست کے اندر اپنی جداگانہ ریاست کا مطالبہ پیش کر دیں۔ ایسا مطالبہ مملکت کے خلاف بغاوت ہوگی۔ مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنی جداگانہ مملکت کا مطالبہ ہندوؤں کی متحدہ مملکت کے اندر نہیں کیا تھا وہاں صورت یہ تھی کہ انگریز ملک کو چھوڑ کر جا رہا تھا اور سوال یہ تھا کہ اس کے بعد ملک میں اندازِ حکومت کیا ہوگا ہم نے اس سے مطالبہ کیا کہ ہم ہندو قوم کے افراد نہیں۔ اسلئے ہم ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔ اپنی جداگانہ مملکت چاہتے ہیں۔ یہ تھے وہ حالات جن میں ہم نے جداگانہ مملکت کا مطالبہ کیا تھا۔ سوچئے کہ ان حالات میں اور پاکستان میں غیر مسلموں کے موجودہ حالات میں کیا مماثلت ہے جو ہم اس سے گھبرا جائیں کہ اگر انھوں نے جداگانہ مملکت کا مطالبہ کر دیا تو ہم کیا کریں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہندو کے ذہن میں یہ تصور کبھی آ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ تو خود ہماری کمزوری تھی جس کی وجہ سے ہم نے انھیں اس قدر اہمیت دیدی

انھیں تو تم کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا حضور ہم نے بنایا جناب ہم نے کیا

ہم کسی کے خلاف دھاندلی نہیں کرنا چاہتے۔ مسلمان تو قرآن کے حدود میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ دشمن تک سے بے انصافی نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ ہم ان سے بے انصافی کریں جنھیں قرآن نے ہماری حفاظت میں دے رکھا ہے۔ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو جو پوزیشن ملتی ہے وہ اسلامی قوانین کے مطابق ملتی ہے۔ یہ ظلم نہیں، قانون کی پابندی ہے۔ اور ہم کسی کی خاطر اپنا قانون بدل نہیں سکتے۔ ان قوانین کے بدلنے کا ہمیں حق ہی حاصل نہیں وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ (۶/۱۱۵) قوانین خداوندی کو کوئی بھی بدل نہیں سکتا۔

یہ ہے ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق انتخاب کے مسئلہ اور اس کے تضمنات کی نوعیت۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو فیصلہ ڈھاکہ میں ہوا ہے وہ قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ لیکن (جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں) کہ یہ فیصلہ درحقیقت ہمارے دستور پاکستان کا فطری نتیجہ ہے۔ لہٰذا اصل کرنے کا کام یہ ہے کہ اس آئین کو از سر نو اسلامی خطوط پر تشکیل کیا جائے اور یہ اسی صورت میں ہو سکیگا جب آپ قرآن اور اسکی روشنی میں انسانی فکر و بصیرت کو دستور کی بنیاد قرار دینگے۔ ہمارے علمائے کرام نے جس دستور کو عین اسلامی قرار دیا تھا۔ اس کا پہلا پھل مخلوط انتخاب کی شکل میں ہمارے سامنے آگیا ہے اور ابھی تو یہ دستور محض کاغذوں کے اندر ہے اسے عملاً نافذ ہونے دیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس پھلجھڑی سے کس کس قسم کے شگوفے پھوٹتے ہیں۔

لیکن اگر آپ اس آئین کو بدستور اسلامی قرار دیئے جائیں اور پھر مخلوط انتخاب کی مخالفت یا دانستہ فتنہ پردازی ہو یا نادانستہ ابلہ فریبی۔ نتیجہ دونوں کا تخریب ہے۔ درخت کو شجر طیب قرار دیکر اس کی جڑوں کو پانی دیتے جانا اور اسکے پھل کیلئے ٹھوکریں کھانا یا فریب دہی ہو یا حماقت۔ وہ دانا کی دشمنی ہے یہ نادان کی دوستی اور نتیجہ دونوں کا تباہی۔ لہٰذا ہم ان حضرات سے جو دل میں اسلام کا درد اور پاکستان کی بہی خواہی کا جذبہ صادق رکھتے ہیں درخواست کرینگے کہ وہ اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اس غیر اسلامی فیصلے کے سرچشمہ کو بند کرنے کی کوشش کریں۔ واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب۔

سلیم کے نام

"اس دور میں دیانتدار بننا حماقت ہے!"

(In Rome Do As Romans Do)

ہاں سلیم! مجھے اس انقلاب کا علم ہے، اور تم سے بھی زیادہ علم جو راشد صاحب میں واقع ہوا ہے۔ ان کی تقسیم ہند سے پہلے کی زندگی بھی میرے سامنے ہے اور بعد کی بھی۔ وہ ہندوستان میں بہترین دیانتدار، قابل، محنتی، اور فرض شناس افسر تسلیم کئے جاتے تھے۔ انگریز تو تو ایک طرف ہندو تک بھی ان کی دیانت اور صداقت کے معترف تھے۔ پاکستان آئے تو قوم کی فلاح و بہبود اور ملک کی خدمت کا بے پناہ جذبہ دل میں لئے ہوئے۔ میں بھی اتفاق سے اسی گاڑی میں سفر کر رہا تھا جس میں وہ کراچی آ رہے تھے۔ راستہ بھر یہی باتیں ہوتی رہیں۔ انھیں پاکستان سے عشق تھا۔ اس کی تشکیل پر ان کی جبینِ نیاز میں، بارگاہِ ایزدی میں شکر کرنے کے ہزاروں سجدے تڑپ رہے تھے۔ وہ اس پر اس قدر خوش تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ وہ کہتے تھے کہ کام تو میں نے پہلے بھی بڑی محنت اور جانفشانی سے کیا ہے لیکن اب تو یہ کام کا کام اور جہاد کا جہاد ہے۔ اب اس محنت میں کچھ اور ہی لذت ملیگی۔ غرضیکہ سارا سفر انہی باتوں میں کٹا۔ ان کے ذہن میں بڑی بڑی اسکیمیں تھیں کہ اب یہ کیا جائے گا اور وہ کیا جائے گا۔ چنانچہ یہاں پہنچکر انھوں نے اپنے پروگرام کے مطابق کام شروع کر دیا اور چند ہی دنوں میں اس کی مثال قائم کر دی کہ محنت اور دیانت، فرض شناسی اور احساسِ ذمہ داری، جذبۂ خدمت اور جنونِ بہبود ملت کسے کہتے ہیں۔ جن حالات میں یہاں دفاتر کے قیام کی ابتداء ہوئی ان کا تمہیں علم ہے۔ نہ میز تھا نہ کرسی۔ نہ کاغذ تھا نہ قلم دوات نہ کوئی خاص عمارت تھی نہ کمرے۔ کسی کو برآمدے میں جگہ ملی ہے تو وہیں بیٹھ گیا۔ نہیں تو باہر درخت کے سائے میں خیمہ (TENT) لگا لیا۔ بیٹھنے کے لئے جگہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ راشد صاحب اُس زمانے میں ڈائرکٹر تھے (اس زمانے کے ڈائرکٹروں کی طرح نہیں تھے کہ ابھی کل کلرک تھے اور آج ڈائرکٹر بن گئے۔ اُس زمانے میں آئی۔ سی۔ ایس کے کافی سینیر افسر ایسی اسامیوں پر تعینات ہوا کرتے تھے) وہ نئی دہلی میں یوں سمجھو کہ ایک محل میں رہتے تھے۔ یہاں انہیں ایک فلیٹ میں ایک کمرہ مل سکا تھا جس میں کل سامان ایک چارپائی تھا۔ انھوں نے اس چارپائی پر بیٹھے سولہ سولہ گھنٹے روزانہ کام کیا۔ اور نہایت خندہ پیشانی سے کام کیا۔ ان کا تمام سامان دہلی سے آنیوالی مال گاڑی میں جل گیا۔ اور گھر بار مشرقی پنجاب میں لُٹ گیا۔ لیکن ان کی زبان پر شکایت کا ایک حرف تک نہ آیا۔ گورنمنٹ نے

کئی بار ان لوگوں سے فہرستیں مانگیں جن کا اس طرح نقصان ہوا تھا۔ لیکن انھوں نے ایک سوئی تک کا مطالبہ نہ کیا۔ حتیٰ کہ اپنے مکان کے بدلے میں کوئی مکان بھی الاٹ نہ کرایا۔ جب بھی اس کا ذکر آتا۔ وہ مسکرا کر کہہ دیتے کہ مجھے تو اللہ نے پھر بھی بہت کچھ دے رکھا ہے یہ انھیں ملنا چاہیئے جن بیچاروں کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ اس آٹھ نو سال کے عرصہ میں ایسی ایسی اسامیوں پر تعینات رہے جن پر اوروں نے لاکھوں روپے بنا لئے تھے۔ لیکن ان کی یہ حالت رہی کہ کیا مجال جو دفتر کی روشنائی سے نجی چٹھی تک بھی لکھی ہو۔ ارباب بست و کشاد کو ان کی دیانت پر اس قدر اعتماد تھا کہ جہاں لوٹ کھسوٹ کا اندھیر مچا، وہاں انھیں پوسٹ کر دیا جاتا۔ اور وہ چند ہی دنوں میں حالات سنوار دیتے۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ یوں حالات سنوارنے سے خود راشد صاحب کے ساتھ کیا ہوتا؟ تم از خود شاید اس کا اندازہ نہ لگا سکو۔ اس لئے کہ ان امور کا تعلق "رموزِ سلطنت" سے ہے۔ جنھیں تمہارے جیسا "گدائے گوشہ نشین" سمجھ نہیں سکتا۔ تم جانتے ہو کہ اس عرصہ کے حالات کی خرابی سے اپنے دفتری کاروبار کے چلنے کی صورت کیا ہو چکی ہے۔ کوئی معاملہ ہو، اس میں حقدار اور غیر حقدار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جو شخص رشوت دے سکتا ہو، جو اثر پیدا کر سکے۔ جو کہیں سے سفارش لا سکے جو اوپر سے اشارہ کرا سکے۔ فیصلہ اس کے حق میں ہو جاتا ہے۔ یہ یہاں کے کاروبار کا عام نہج ہے۔ ایسا عام کہ یہ گویا ایک مسلمہ طریق بن چکا ہے۔ اب راشد صاحب کی یہ کیفیت کہ رشوت دینے والا ان کی کوٹھی کے پاس تک نہ پھٹک سکے۔ ہمعصر افسروں میں سے ایک ایک نے سفارش کر کے دیکھ لیا۔ وہاں کسی کی سفارش کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سیاسی لیڈروں نے (جو رفتہ رفتہ سفارت اور وزارت کی کرسیوں تک بھی جا پہنچتے ہیں) اپنے "حکمنامے" بھیج کر ان کے نتائج دیکھ لئے۔ ارباب حل و عقد نے اپنے "اشاروں" کی ناکامی کے بعد تنگ آ کر یہ سلسلہ بند کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ ہر ایک زبان سے ان کی دیانت کی تعریف کرتا۔ لیکن دل سے چاہتا کہ یہ کانٹا کسی طرح بیچ میں سے الگ ہو تو ان کے کاروبار میں آسانیاں پیدا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ہمعصر افسروں کو (جو بددیانت بھی تھے اور نالائق بھی، کاہل بھی اور کام چور بھی) اس کا حسد کہ یہ اپنی دیانت اور محنت کی بنا پر عوام میں مقبول کیوں ہے۔ لہٰذا وہ بھی چاہتے کہ انھیں کسی طرح نیچے گرا دیا جائے۔ جب کسی کی مخالفت میں اتنے عناصر یکجا جمع ہو جائیں تو ہمارے معاشرہ میں محض دیانت اور محنت کس طرح اس کی حفاظت کر سکتی ہے! نتیجہ یہ کہ پولیس نے چار بازاری غنڈوں کو اپنے ساتھ ملایا اور راشد صاحب کے خلاف رشوت کا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ راشد صاحب کو اس کا زعم تھا کہ تمام افسرانِ بالا اور ارباب حل و عقد ان کی دیانت سے باخبر ہیں۔ وہ ان کے کہنے پر بیسیوں مرتبہ جلتی آگ میں کودے اور وہ کچھ کر کے دکھایا جو کسی کے بس میں نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے سمجھ لیا کہ دو چار آدمیوں کی شرارت ان کا کیا بگاڑ لے گی! لیکن تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ ان سب نے ایک دم آنکھیں پھیر لیں۔ اور راشد صاحب نے چند ہی دنوں میں محسوس کر لیا کہ اس تصادم میں وہ میدان میں بالکل تنہا کھڑے ہیں۔ چنانچہ ان پر چاروں طرف سے بلاؤں نے ہجوم کر دیا۔ ملازمت سے معطل (SUSPEND) ہو گئے تو روٹی تک کے لالے پڑ گئے۔ مقدمہ کی پیروی کے لئے ہزاروں روپے درکار تھے وہ کہاں سے آتے؟ جب کرسی سے الگ ہوئے تو قریب ترین دوستوں اور ماتحتوں نے رسمی ملاقات تک چھوڑ دی۔ رشوت کے الزام سے معاشرہ کی نظروں میں خود بخود مجرم قرار پا گئے۔ اور ساری عزت اور شہرت خاک میں مل گئی۔ وہ جدھر سے نکلتے لوگ ان سے آنکھیں چراتے حتیٰ کہ انھیں

یہ بھی محسوس ہونے لگ گیا کہ اگر کل کو اس کی نوبت آگئی تو شاید کوئی ضمانت دینے والا بھی نہ ملے!

یہ تھے وہ نامساعد حالات جن میں گھرے ہوئے راشد صاحب اُس شام میرے ہاں آئے تھے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ ان کی پریشانی اسی سے ظاہر تھی کہ وہ پہلے بہت کم سگریٹ پیتے تھے۔ لیکن اب کش پر کش لگائے چلے جاتے تھے۔ تم جانتے ہو میرے دل میں ان کے لئے کتنا احترام ہے۔ اس لئے میری ساری ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ اور ہوتی کیوں نہ، جب میں جانتا تھا کہ وہ کس قدر مظلوم اور بے گناہ ہیں۔ لیکن میرے لئے ان کی مصیبت سے کہیں زیادہ پریشان کن بلکہ صدمہ کا باعث ان کا وہ ردعمل تھا جو ان حالات کے خلاف ان کے دل سے ابھر رہا تھا۔ انھوں نے پوری جوش اور شدت سے اپنی داستان کو دہرایا اور ایک ایک شخص نے (جس پر انھیں اس قدر بھروسہ تھا) ان سے جس طرزِ عمل کا ثبوت دیا تھا اسے اس لہجہ سے بیان کیا جس میں مایوسی اور رنج سے کہیں زیادہ غصہ اور انتقام کی جھلک پائی جاتی تھی۔ میں سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کس قدر زخمی دل کی چیخ وپکار ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ میرے جگر کے پار ہوتا جا رہا تھا۔ جب ان کے جذبات میں زیادہ ہیجان پیدا ہوگیا۔ تو میں نے کچھ کہہ کر انھیں تسلی دلانے کی کوشش کی۔ میں نے ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ انھوں نے مجھے ٹوک کر کہا کہ

> معاف کیجئے پرویز صاحب! آپ ایک خیالی دنیا میں بستے ہیں میں اپنے عمر بھر کے تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دیانت داری اور حق وصداقت کے لئے اس دنیا میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس سکہ کا اس بازار میں چلن ہی نہیں۔ انھیں اپنا اصول بنا کر دنیا میں کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میری زندگی کا ایک ایک ورق آپ کے سامنے ہے۔ میں نے پاکستان کے لئے مسلمانوں کے لئے اور ان "بڑی بڑی سرکاروں" کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن مجھے اس دیانت اور صداقت۔ اس محنت اور جانفشانی کا صلہ کیا ملا؟ یہی کہ جگہ جگہ کے کتے میرے پیچھے چھوڑ دیئے گئے اور جن کی خاطر میں نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ ان میں سے کسی میں اتنی مروت بھی نہیں کہ انھیں محض زبان سے دھتکار ہی دے۔ اس کے بعد آپ مجھے دیانت اور امانت کا کیا وعظ سنائیں گے! آپ محض وعظ سناتے ہیں اور میں نے اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ اب میرے سامنے زندگی کا صحیح نقشہ آگیا ہے۔ اب آپ راشد کو ایک مختلف انسان پائیں گے۔ اُف۔
>
> دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نحوت پرستوں نے بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ (In Rome Do As Romans Do) چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ دنیا میں رہنے کا یہی ڈھنگ ہے۔

وہ یہاں تک کہنے پائے تھے کہ باہر سے ایک اجنبی آگیا۔ اور یہ سلسلہ کلام منقطع ہوگیا۔ یہ ہیں راشد صاحب کے وہ تاثرات جن کی بنا پر تم بھی کہتے ہو کہ وہ حق بجانب ہیں اور ہمارے پاس ان کی ان شکایات کا کوئی جواب نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ

ان کی شکایات حق بجانب ہیں۔ ایک ایسے معاشرہ میں، جو صداقت اور دیانت کی اقدار کا قدردان ہو، ان کی بے لوث خدمات کا صلہ کچھ اور ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اس سے وہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں اس سے میں متفق نہیں۔ میں ان کے اس ردعمل کو غلط سمجھتا ہوں۔ ایسا غلط کہ مجھے اس کا سخت صدمہ ہے۔ مجھے پہلے اس بات کا افسوس تھا کہ ان ناعاقبت اندیش ارباب بست وکشاد نے اپنی لاابالی سے ایک عمدہ افسر کو ہاتھ سے کھو دیا۔ لیکن راشد صاحب کے ان تاثرات کے بعد مجھے اس کا رنج ہوا کہ ایک عمدہ افسر ہی نہیں انھوں نے ایک قیمتی انسان کو ضائع کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی افسوس تھا کہ راشد صاحب ایک ہی دھچکے میں کہاں سے کہاں آ گرے! خدا کرے ان کا یہ ردعمل ہنگامی اور عارضی ہو اور وہ اس کے بعد پھر سنبھل جائیں۔ مجھے ان سے اس کی توقع تو بہت ہے۔ آئندہ خدا جانے!

اب میں تمہارے اس سوال کی طرف آتا ہوں کہ ایسے مقامات میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اور ان دھچکوں سے بچنے کی کیا صورت بتاتا ہے۔ (واضح رہے کہ جو کچھ میں اب کہنے والا ہوں اسے میں نے مختلف نشستوں میں راشد صاحب کے کان میں ڈال دیا تھا۔ اب وہ یہاں نہیں۔ خدا کرے کہ انھوں نے اس کا اثر لے لیا ہو۔ بہرحال تم غور سے سنو) قرآن سلیم! انسان کو اتنا اونچا لے جاتا ہے کہ وہ ان دھچکوں کی دسترس سے باہر ہو جاتا ہے۔ وہ انسان کو سکھاتا یہ ہے کہ وہ آئین وفا کو اس لئے اختیار نہ کرے کہ اسے اس کا "نخوت پرستوں" کی طرف سے کچھ صلہ ملے گا۔ وہ وفا کو وفا کی خاطر اختیار کرے۔ اس کے لئے اس نے ایک ایسا گر بتایا ہے جو لفظی اعتبار سے اس قدر سمٹا ہوا ہے لیکن معنوی اعتبار سے اس قدر پھیلا ہوا کہ ان دونوں جہتوں سے بے مثل و بے نظیر ہے۔ وہ گر یہ ہے کہ تم جو کام بھی کرو للہ (اللہ کے لئے) یا فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں) کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم یہ الفاظ سنکر جی میں کہو گے کہ میں نے یہ کیا "مولویانہ" سی بات کہدی! تم ایسا خیال کرنے میں سچے ہو۔ اس لئے کہ ہمارے مروجہ مذہب میں یہ الفاظ اپنی حقیقت سے دور ہٹ کر ایسے "عامیانہ" سے ہو گئے ہیں کہ انھیں سنکر ذہن کسی بلند تصور کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن سلیم! سچ جانو کہ یہ الفاظ انسانی تصور و تخیل کو ان بلندیوں تک لے جاتے ہیں جن سے آگے کوئی اور بلندی نہیں۔ یہ مختصر سے الفاظ بہت بڑی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ قرآن کی رو سے اللہ کائنات کی تمام مستقل اقدار کا سرچشمہ اور ان صفات کا مظہر ہے جو اپنی قیمت آپ ہیں۔ یعنی ان کی قیمت اضافی (RELATIVE) نہیں بلکہ ذاتی (INTRINSIC) ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس حقیقت کو یوں سمجھو کہ اللہ اس مکمل ترین ذات (PERSONALITY) کا نام ہے جو انسان کی ذات (PERSONALITY) کی تکمیل کیلئے معیار (STANDARD) کا کام دیتی ہے۔ لہٰذا جب کوئی یہ کہے کہ میں یہ کام اللہ کے لئے کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں اسے خود اپنی ذات کی تکمیل کے لئے کرتا ہوں۔ کائنات کی مستقل قدر سمجھ کر کرتا ہوں۔ اعلیٰ ترین شرف انسانیت کا موجب جان کر کرتا ہوں۔ کسی سے صلہ کی امید یا ستائش کی تمنا کی وجہ سے نہیں کرتا۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ قرآن انسان کی وفا شعاریوں

(LOYALTY) کو نہ دوسرے انسانوں کے ساتھ وابستہ کرتا ہے، اور نہ اضافی قیمتوں کے ساتھ، جو ہر آن تغیر پذیر ہوتی ہیں۔ وہ اسے اس چشمۂ حسن و خوبی سے وابستہ کرتا ہے جس میں کبھی تغیر نہیں آتا۔ اس لئے اسے کبھی ایسا کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ

بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

اس حقیقت کو قرآن نے اُسوۂ ابراہیمی کے رنگ میں نہایت حسن کارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ سلیم! حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت عجیب و غریب ہے، وہ ہم میں کا ایک چلتا پھرتا انسان نظر آتا ہے۔ غمخواریوں کا مجموعہ۔ شفقتوں کا مجسمہ۔ محبت کا پیکر۔ انھیں دیکھ کر انسان کا جی، ایک دیوتا کی طرح پرستش کرنے کو نہیں، بلکہ ایک ہمدرد دوست اور مشفق بزرگ خاندان کی طرح محبت کرنے کو چاہتا ہے۔ اللہ نے انھیں خلیل کہہ کر ان کی پوری سیرت کو ایک نگینہ میں سمٹا دیا ہے۔ تم دیکھو کہ سیرت ابراہیمیؑ کا ایک ایک نقشِ قدم کس طرح ہماری راہ نمائی اس بلند نصب العین کی طرف کرتا ہے کہ تمام تغیر پذیر ہستیوں اور اضافی قیمتوں سے ہٹ کر اپنی وفاشعاریوں کو انسانیت کی بلند ترین اقدار کے اس سرچشمہ سے وابستہ رکھو جو تغیرات سے بلند اور حوادثات سے ماورا ہے۔ غور سے دیکھو کہ ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بڑی بڑی درخشندہ حقیقتیں جگ مگ جگ مگ کر رہی ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ ایک ستارہ پرست قوم میں پیدا ہوئے تھے۔ جب زہرہ ستارے نے سرِ شام نقاب الٹا تو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اچھا! یہ ہے جس کی طرف تم مجھے دعوت دیتے ہو۔ اور جب وہ چھپ گیا تو آپ نے کہا کہ بس! یہی ہے وہ معبود جو ابھی تھا اور ابھی نہیں رہا۔ اسی طرح چاند اور سورج کے ساتھ ہوا۔ اس مقام پر حضرت ابراہیمؑ نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ حقائق کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتے ہیں۔ قرآن میں ہے فَلَمَّا اَفَلَ۔ قَالَ لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (جب وہ ستارہ) چھپ گیا تو آپ نے کہا کہ میں ڈوب جانے والوں کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنا نہیں چاہتا میں ان سے کوئی امیدیں وابستہ نہیں رکھنا چاہتا جن میں ہر آن تغیر واقع ہوتا رہے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (میں اپنی توجہات کو ہر سمت سے ہٹا کر اس ذات کی طرف مرکوز کرتا ہوں جو تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لائی۔ میں سیدھا اس طرف رخ کرتا ہوں۔ اور اس نصب العین میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔

یہ ہے سلیم! اندازِ ابراہیمی۔ انسان کا قبلۂ مقصود آفلین کیوں ہوں؟ جو ابھی چمک رہے ہوں اور ابھی ڈوب جائیں وہ اس کی تمناؤں کا مرکز کیوں بنیں؟ ذرا سوچو سلیم! کہ ہماری مایوسیوں اور افسردگیوں کی وجہ یہی نہیں کہ ہم آفلین کے ساتھ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور جب وہ ڈوب جاتے ہیں تو ہم رونا شروع کر دیتے ہیں؟ ابراہیمی نگاہ ان سب کو پیچھے

چھوڑ کر اس مرکزِ حسن و خوبی تک پہنچتی ہے جو تغیرات سے ناآشنا ہے۔ اور وہاں پہنچکر علی وجہ البصیرت پکار اٹھتی ہے کہ میں نے اپنا رشتہ اس سے جوڑا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ۔ وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ۔ وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ۔ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ وَالَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ (۲۶/۷۸-۸۲) جس نے مجھے پیدا کیا اور زندگی کے نصب العین کی طرف راہ نمائی کی۔ اور اس کے ساتھ ہی میری طبیعاتی زندگی کی نشوونما کے اسباب بھی بہم پہنچائے۔ اسی کے قانون کے مطابق مرض آتا ہے۔ اور اسی کے مطابق میں شفایاب ہوتا ہوں۔ موت اور حیات بھی اسی کے قانون کے ساتھ وابستہ ہے اور اسی کے قانونِ مکافات سے مجھے توقع ہے کہ وہ میری بھول چوک کے مضر اثرات سے میری حفاظت کا سامان بہم پہنچائے گا۔ دیکھا تم نے سلیم! ابراہیمی نظر کس طرح تغیر پذیر اسباب و علل سے آگے بڑھ کر براہ راست خدا کے ابدی قانون تک جا پہنچتی ہے۔ اور اس راستے میں جو جو موانعات سامنے آتے ہیں انھیں بلا تامل و توقف بے باکانہ الگ کرتی ہوئی سیدھی اپنے نصب العین کی طرف بڑھے چلی جاتی ہے؛ اگر اس راستے میں باپ حائل ہوا ہے تو اس سے برملا کہہ دیا کہ یٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْکَ شَیْئًا (۱۹/۴۲) تم ایسی چیز کو اپنا معبود کیوں بنائے ہوئے ہو جو سماعت و بصارت تک سے محروم ہے اور جو تمہارے کسی بھی کام نہیں آ سکتی۔ اور اگر قوم روک بن کر کھڑی ہوئی ہے تو اس سے بے دھڑک کہہ دیا جاتا ہے کہ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ کَفَرْنَا بِکُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ (۶۰/۴) ہم تم سے اور ان سے جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہوئے ہو بالکل بے تعلق ہیں۔ ہم تم سے بیزار ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان دشمنی اور نفرت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیگی تا آنکہ تم صرف ایک اللہ پر ایمان نہ لے آؤ۔ حتیٰ کہ اگر اس ملک کا سب سے بڑا اقتدار و قوت کا مالک مستبد بادشاہ بھی ان کے آڑے آتا ہے تو اسے بھی اس طرح جھڑک دیتے ہیں کہ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ (۲/۲۵۸) وہ ہکا بکا رہ جاتا ہے۔

اس طرح ایک ایک سے تعلقات منقطع کر لینے کے بعد بھی جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ فضا میرے نصب العین کے حصول کے لئے ناسازگار ہے تو اپنے وطن سے یہ کہہ کر دامن فشاں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (۳۷/۹۹) اور اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ (۲۹/۲۶) لو میں چلا اپنے پروردگار کی طرف۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ حضرت ابراہیم کیا کہہ کر وطن سے کنارہ کش ہوتے ہیں؟ یہ کہہ کر کہ "میں اپنے اللہ کی طرف جا رہا ہوں"۔ یہ ظاہر ہے کہ اللہ کا کوئی خاص مقام نہیں وہ ہر مقام میں موجود ہے۔ اس لئے انی ذاہب الی ربی سے یہ مطلب نہیں کہ میں کسی خاص مقام کی طرف جا رہا ہوں جہاں مجھے اللہ مل جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ میرا مطلوب و مقصود اللہ ہے۔ اگر یہ فضا اس مقصود کے حصول کے لئے سازگار نہیں تو اس فضا میں میرے لئے کوئی جاذبیت نہیں۔ میں اس فضا کی تلاش میں جاتا ہوں جو اس مقصد کے لئے سازگار ہو۔ وہ وطن چھوڑ کر

جاتے ہیں تو اس انداز سے کہ پھر اس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔ حتیٰ کہ انھیں عزیز رشتہ دار آواز دیتے ہیں تو وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ تم میرے نہیں ہو۔ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ (۱۴/۳۶) میرے وہ ہیں جو اس مقصد کے حصول میں میرے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ جو اللہ کا نہیں وہ میرا کیسے ہو سکتا ہے۔

مجھے بھلا ان سے واسطہ کیا جو اس سے ناآشنا ہے ہیں!

اس طرح وہ دنیا کی ہر آفل آستان سے سرکشیدہ گذرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں اس تغیر ناآشنا کعبۂ مقصود سے آواز آتی ہے تو اس کے سامنے فوراً سر جھکا دیتے ہیں۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ. قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۲/۱۳۱) جب اس کے رب نے کہا کہ جھک جا۔ تو اس نے نہایت خندہ پیشانی سے کہہ دیا کہ لیجئے! میں "رب العالمین" کے لئے جھک گیا۔ اور ان کا یہ جھکنا دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ ہوتا (اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۳۷/۸۳)

تم نے دیکھا سلیم! کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس اطاعت گذاری اور فرماں پذیری کے ساتھ "رب العالمین" کہہ کر کس طرح نگاہ کو اس بلند حقیقت کی طرف منعطف کر دیا کہ نہ اُس (غیر اللہ) سے سرکشی کا جذبہ محرک کسی سے ذاتی نفرت اور عناد تھا اور نہ اس تسلیم و انقیاد سے مقصود کوئی ذاتی منفعت ہے۔ وہ بھی انسانیت کی بلند اقدار کی خاطر تھا۔ اور یہ بھی اسی مقصد کے لئے۔ چنانچہ جب انھوں نے "دنیا کے بت کدہ میں وہ پہلا گھر خدا کا" تعمیر کیا جس کی وجہ سے ان کا نام ابد الآباد تک روشن رہنا تھا تو اس وقت ان کے دل میں یہ جذبہ کارفرما نہیں تھا کہ میں یہ کچھ اپنے کسی مقصد کے لئے کر رہا ہوں۔ اس وقت بھی ان کے لب پر یہ حسین آرزوئیں مچل رہی تھیں کہ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۲/۱۲۷) اے ہمارے نشوونما دینے والے! میں اپنی محنتوں کے حاصل کو تیری بارگاہ میں پیش کرتا ہوں۔ تو اسے شرفِ قبولیت عطا فرما۔ تو الفاظ کو سننے والا اور دلوں کے ارادوں کو جاننے والا ہے۔ اس لئے تجھے معلوم ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ یہ میرے دل کی گہرائیوں سے ابھر رہا ہے تو اسے قبول فرما۔

کہ گل بدست تو از شاخ تازہ ترماند

یہ تھے سلیم! پیکر خلت و اخلاص، حضرت ابراہیمؑ جن کے متعلق خدا نے کہہ دیا کہ وہ ایک فرد نہیں تھے۔ ان کی ذات میں پوری کی پوری امت سموئی ہوئی تھی۔ ایسی امت جو اپنا سب کچھ اللہ کے لئے وقف کئے۔ اس میں کسی اور جذبہ یا مقصد کو شریک نہ کرے۔ اسی کا نام توحید ہے (اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (۱۶/۱۲۰) ان کی خصوصیتِ کبریٰ یہ تھی کہ وہ "شرک" کے مرتکب نہیں تھے۔ وہ اپنی وفاشعاریوں کو کسی آفل کے ساتھ وابستہ نہیں کرتے تھے۔ ستائش کی تمنا یا صلہ کی امید پر نہیں کرتے تھے۔ جو ایسا کرتے ہیں، وہ شرک کے مرتکب ہوتے ہیں اور تم جانتے ہو کہ شرک کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سنو کہ قرآن اسے کن الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ سورہ حج میں ہے وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ جو اس عظیم اور بلند نصب العین کے ساتھ کسی اور جذبہ کی آمیزش کرتا ہے

اس کی کیفیت یوں سمجھو جیسے کوئی آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرے فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اور اسے کوئی شکاری پرندے یوں اچک کیے جائے (جیسے چڑیا کے بچے کو چیل اچک کیے جاتی ہے) أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ (۲۲/۳۱) یا اسے ایک پرکاہ کی طرح سمجھو۔ جسے ہوا کے جھونکے اڑا کر کہیں کا کہیں پھینک دیں۔

سن لیا ہے ہو سلیم! قرآن کیا کہتا ہے؟ ان الفاظ پر بار بار غور کرو۔ اور دیکھو کہ تمہاری روح کس طرح رقص میں آجاتی ہے!

یہ ہے وہ مسلکِ ابراہیمی جسے قرآن نے اسلام کہہ کر پکارا ہے۔ اور جس کی اتباع کا حکم نبی اکرمؐ اور حضورؐ کی وساطت سے تمام نوعِ انسانی کو دیا ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (۴/۱۲۵)

اور اس سے زیادہ حسین مسلک اور کس کا ہوسکتا ہے۔ جس نے اپنے تمام رجحانات و مقاصد کا مرکز اللہ کو قرار دے لیا اور پھر حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی۔ یہی ہے جو ہر طرف سے منہ موڑ کر مسلکِ ابراہیمی کی پیروی کرتا ہے۔

اسی کا اعلان نبی اکرمؐ کی زبانِ اقدس سے یہ کہہ کر کرایا گیا کہ

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۶/۱۶۲)

ان سے کہدو کہ میرے پروردگار نے میری رہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف کردی ہے۔ یعنی ابراہیم کے محکم اور متوازن مسلک کی طرف۔ وہ ابراہیم جو ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ کا ہو چکا تھا۔ اور شرک کے پاس تک نہیں پھٹکتا تھا۔

اور اس کے بعد وہ عظیم اعلان ہے جسے میرے نزدیک تمام نوعِ انسانی کا واحد نصب العین اور اسلام کا منشور (MANIFESTO) سمجھنا چاہیئے۔ وہ اعلان یہ ہے کہ

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (۶/۱۶۳-۱۶۴)

حقیقت یہ ہے کہ میرے تمام فرائضِ زندگی اور ان کے حصول کے طور طریقے (مختصر الفاظ میں یہ کہ) میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسانی کی نشوونما کا ذمہ دار ہے

میرے اس مقصدِ توحید میں کسی اور جذبہ کی آمیزش نہیں۔ میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا مجھے اسی مسلک کے اختیار کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ اور میں سب سے پہلے اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہوں۔

یہ ہے سلیم! اسلام اور یہ ہے ایک مسلم کی زندگی کا نصب العین۔ اس کی زندگی کی ہر نقل و حرکت۔ ہر سعی و کاوش، ہر جدوجہد، ہر تگ و تاز کا مقصد ایک اور صرف ایک ہوتا ہے۔ یعنی انسانیت کی بلند اقدار۔ وہ اقدار جن کا سرچشمہ حقیقی اللہ کی ذات ہے۔ وہ ان اقدار کو صرف اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اس سے اس کی اپنی ذات، اس سرچشمہ حسن و خوبی سے ہم آہنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی یہ جدوجہد نہ کبھی اور ہستی کے لئے ہوتی ہے۔ نہ کسی دوسرے مقصد کی خاطر۔ اس لئے اگر اس کی راہ میں مصائب و مشکلات کے پہاڑ آتے ہیں۔ اس کے دنیاوی رفیق ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ تو وہ ان مشکلات سے گھبراتا ہے۔ نہ ان ساتھیوں کے اس طرزِ عمل سے مایوس ہوتا ہے۔ وہ ان تمام ناسازگار حالات کو للکارتا اور دل کے پورے اطمینان سے کہتا ہے کہ ان خطرات و نوائب سے نہ تم میرے رخ کی سمت بدل سکتے ہو۔ نہ میرے پاؤں میں لغزش پیدا کر سکتے ہو۔ اس لئے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (۲/۱۵۶) ہم تو اپنا سب کچھ اللہ کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ اس لئے ہمارا ہر قدم اسی کی طرف اٹھے گا۔ تمہارا جو جی چاہے کر کے دیکھ لو۔ قرآن کہتا ہے کہ

اُولٰٓئِکَ عَلَیْہِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّہِمْ وَرَحْمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ (۲/۱۵۷)

یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا تحسین و آفرین کے پھول برساتا ہے۔ اور ان کے لئے سامانِ مرحمت بہم پہنچاتا ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو زندگی کے صحیح راستے پر گامزن ہیں۔

وہ کسی آفل سے اپنی توقعات وابستہ نہیں کرتے۔ وہ کسی سے کوئی اجر یا صلہ نہیں مانگتے۔ وہ دیانت اور صداقت کی روش کو صرف اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ انسانیت کی یہی صحیح راہ ہے۔ وہ صداقت کو صداقت کی خاطر اختیار کرتے ہیں۔ یہی وہ بلند حقیقت ہے جس کا ہر رسول اپنی دعوت کے آغاز میں یہ کہہ کر اعلان کرتا ہے کہ

فَمَا سَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (۱۰/۷۲)

میں (تمہارے لئے جو کچھ کرتا ہوں) اس کا کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا۔ میرا اجر صرف اللہ پر ہے

تم نے غور کیا سلیم! کہ یہاں قرآن نے کتنی بلند حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ نفسیاتی طور پر کوئی شخص کسی کام کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کا جذبۂ محرکہ کسی مقصد کا حصول نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ غرض یا مقصد کا پیشِ نظر ہونا کوئی برائی نہیں۔ لیکن تمہارے اغراض و مقاصد دوسرے انسانوں کے ساتھ وابستہ نہیں ہونے چاہئیں۔

یہ اس ذات سے وابستہ ہونے چاہئیں جس کی صفات سے ہم آہنگی تمہاری اپنی ذات کی نشوونما کی دلیل ہے۔ بالفاظ دیگر تمہیں ایک بلند قدر کو اس لئے اختیار نہیں کرنا چاہیئے کہ اس کا بدلہ لوگوں کی طرف سے ملے گا۔ اسے اس لئے اختیار کرنا چاہیئے کہ وہ قدر اپنے اندر اپنی قیمت آپ رکھتی ہے۔ ذاتی اور خارجی بدلہ کی مثال یوں سمجھو کہ تم کسی قلی سے کہتے ہو کہ وہ تمہارے دوست تک تمہارا خط پہنچا دے (جس کا مکان دو میل کے فاصلے پر ہے) یہ قلی یہ دو میل کا فاصلہ محض اس لئے طے کرتا ہے کہ اسے اس کے بدلہ میں آٹھ آنے کے پیسے ملیں گے۔ یہ اس کام کا خارجی بدلہ ہے۔ لیکن جب تم صبح سویرے اٹھ کر دو میل کی سیر کرتے ہو تو اس لئے نہیں کہ تمہیں کہیں سے اٹھنی ملے گی۔ بلکہ اس لئے کہ اس سے تمہاری صحت اچھی ہوگی یعنی یہ دو میل کا سفر اپنی قیمت اپنے اندر خود رکھتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جسے قرآن نے ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے کہ خدا کے قانون مکافات عمل کی رو سے اعمال اپنا بدلہ آپ ہوتے ہیں۔ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲۷/۹۰) یعنی یہ بدلہ (یا نتیجہ) خود اس عمل کا جزو ہوتا ہے۔ اسی طرح اہل جنت کے متعلق کہا کہ وہ ایک ایسے چشمہ سے سیراب ہونگے يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا (۷۶/۶) جسے وہ خود بہا کر لائیں گے۔ کہیں خارج سے بہتا ہوا نہیں آئے گا۔ یہی مطلب ہے هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ (۵۵/۶۰) کا یعنی حسن عمل خود اپنا بدلہ آپ ہے۔ تم نے حسن پیدا کرنا چاہا، حسن پیدا ہو گیا۔ یہی تمہاری کوشش کا بدلہ ہے۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن انسان کو کس بلند مقام پر لے جاتا ہے۔ وہ حسن عمل کے بدلہ کے لئے کسی انسان کی طرف رخ ہی نہیں کرنے دیتا۔ اسی لئے وہ دفاشعاریوں کا مرکز کسی انسان کو قرار نہیں دیتا اور تو اور خود اس عظیم انسانؐ کے متعلق جس سے بلند مقام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خود اس کی زبان اقدس سے کہلوا دیا کہ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ (۷/۱۸۸) ان سے کہہ دو کہ میں (دوسروں کے لئے تو ایک طرف) خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کی مقدرت نہیں رکھتا۔ یہ سب اللہ کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اگر مرجع و مرکز حضورؐ کی ذات کو قرار دیدیا جاتا تو آپؐ کی وفات کے بعد امت کی تمام امیدوں کا مرکز ٹوٹ جاتا۔ اور ان پر مایوسی چھا جاتی۔ اس کے لئے یہ پہلے ہی اعلان کر دیا گیا کہ

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَائِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ..... (۳/۱۴۴)

محمدؐ بجز اس نیست کہ (اللہ کا) رسول ہے اس سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے ہیں۔ سو اگر یہ (کل کو) مر جائے یا قتل ہو جائے تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے!

اس حقیقت کو دست پروردگانِ رسالت ایسا واضح طور پر سمجھے ہوئے تھے کہ جب حضورؐ کی وفات پر دلوں میں اضطراب پیدا ہوا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ منبر پر تشریف لائے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ

ایھا الناس من کان یعبد محمدا فانہ قد مات ومن کان یعبد اللہ

فانہ حیّ لا یموت۔

اے لوگو! تم میں سے جو شخص محمدؐ کی عبودیت اختیار کئے تھا۔ تو اس کا معبود واقعی مرگیا ہے لیکن جو خدا کی عبودیت اختیار کئے تھا تو اسے سمجھ رکھنا چاہیئے کہ اس کا معبود ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ وہ کبھی نہیں مرسکتا۔

قرآن وفاشعاریوں کا مرکز اس ذات کو قرار دیتا ہے جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ کبھی مرتی نہیں۔ اس لئے جو شخص اس مرکز سے اپنا رشتہ وابستہ کرتا ہے وہ کبھی مایوس نہیں ہوسکتا۔ جو بلند اقدار کو (کسی انسان سے صلہ پانے کی غرض سے نہیں بلکہ) بلند اقدار کی خاطر اختیار کرتا ہے اسے کبھی تلخ کام ہو کر یہ نہیں کہنا پڑتا کہ

بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

آخر میں سلیم! میں ایک ایسی بلند حقیقت تمہارے سامنے لانا چاہتا ہوں جو اس باب میں فی الحقیقت حرفِ آخر ہے ہم میں سے جو لوگ نیک کام کسی دنیاوی غرض سے یا کسی دوسرے انسان کی خاطر نہیں کرتے۔ ان کا مقصد حصولِ جنت ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ جنت ہے۔ اور یہ بہت بڑی (ACHIEVEMENT) ہے لیکن قرآن انسان کو اس سے بھی اونچا لے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جنت بیشک بہت بڑا صلہ ہے۔ لیکن حسنِ عمل سے ایک چیز اور حاصل ہوتی ہے جو اس سے بھی بڑی ہے۔ وہ کیا ہے؟ ذرا غور سے سنو۔ سورۂ توبہ میں ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ

مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ نے اس جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ جس کی شادابیوں میں کبھی کمی نہیں آسکتی۔ ان پُرآسائش باغات میں وہ خوشگواریوں کی زندگی بسر کریں گے

بیشک یہ ان کے حسنِ عمل کا بہت بڑا ثمر ہے۔ لیکن وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ اس سے کہیں بڑا صلہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی ذات سے ہم آہنگ ہوجائیں گے ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (یہ ہے یہ سب سے بڑی کامیابی)۔ اللہ کی ذات سے ہم آہنگی سے مطلب یہ ہے کہ جس مکمل ترین۔ بلند ترین اور حسین ترین ذات کو انھوں نے اپنی تکمیل کے لئے نصب العین بنایا تھا۔ اس کی صفات (بشریت کی حدود کے اندر) ان کی اپنی ذات میں منعکس ہوجائیں گی۔ اس حد تک ان دونوں میں ہم آہنگی ہوجائے گی۔ اور چونکہ مقصود بالذات، اس مقام کا حصول تھا (یعنی مستقل اقدار سے موافقت و مطابقت) نہ کہ جنت۔ اس لئے یہی لوگ ہیں جو اپنی مراد کو پہنچیں گے۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ قرآن حسنِ عمل کے لئے کس مقصد کو جذبۂ محرکہ قرار دیتا ہے۔ جس انسان کے سامنے یہ حقیقت ہو

وہ ان بلند اقدار انسانیت کو حصول جنت کے لئے بھی اختیار نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو ان اقدار کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ خوشگواریوں کی خارجی جنت کے حصول کے لئے سعی و عمل میں پھر بھی معاوضہ کا شائبہ آجاتا ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو اپنے شرح انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ

دل بے قیدِ من با نورِ ایماں کافری کردہ ... حرم را سجدہ آوردہ بتاں را چاکری کردہ

متاعِ طاعتِ خود را ترازوئے برافرازد ... ببازارِ قیامت با خدا سوداگری کردہ

مومن کی نگاہ سوداگرانہ نہیں ہوتی۔ اس کے نزدیک حسن عمل اپنا صلہ آپ ہوتا ہے۔ جب انسان کی نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی آجاتی ہے۔ تو خارجی سہارے ہزار ٹوٹتے ہیں اس پر کبھی مایوسی طاری نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶) اس نے ایک ایسا محکم سہارا تھام رکھا ہوتا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اگر ہم دیانت کو دیانت کے لئے اختیار کریں تو ہمیں اس کی پرواہ ہی نہیں ہوگی کہ دوسرے اس کے جواب میں کیا کرتے اور کیا کہتے ہیں۔ اگر ہم صداقت پر صداقت کے لئے قائم رہیں تو ہمیں اس کا خیال بھی نہیں گزرے گا کہ ہمیں اس کا صلہ کیا ملتا ہے؟ اگر ہم وفا کو وفا کے لئے اختیار کریں تو ہمارے سامنے کوئی حادثہ ایسا نہیں آسکتا جس سے ہم آئینِ وفا بدلنے پر مجبور ہوجائیں۔

سوچو سلیم! کہ جس معاشرے میں افراد ان بلند اقدار انسانیت کو محض ان اقدار کی خاطر اختیار کریں۔ اس معاشرہ میں زندگی کس قدر حسین ہوگی۔ طوبیٰ لھم وحسن مآب۔

اب بتاؤ کہ تم راشد صاحب کے اس ردعمل کو کس حد تک حق بجانب سمجھتے ہو؟

والسلام پرویز

مکرر:- میں یہ خط لکھ چکا تھا کہ مجھے راشد صاحب کا خط موصول ہوا۔ اور تم یہ سنکر خوش ہو گے کہ میں نے ان سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ غلط ثابت نہ ہوئیں۔ وہ اپنے خط میں تمہیدی فقرات کے بعد لکھتے ہیں:-

مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس دن آپ کی بات کو عجیب بے ہنگم طریق سے کاٹ دیا۔ اور اس کے بعد بھی آپ وقتاً فوقتاً جو کچھ کہتے رہے اسے بھی میں بے رغبتی اور بے اتفاقی ہی سے سنتا رہا۔ میں اس کے لئے اس سے زیادہ اور کسی معذرت کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میں اُن دنوں جن حالات سے گزر رہا تھا۔ ان میں جذبات پر قابو رکھنا میرے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ بالآخر دل ہی تو تھا نہ سنگ و خشت۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی میری کمزوری تھی۔ مجھے اس کی بڑی خوشی ہے کہ جو کچھ آپ مجھ سے وقتاً فوقتاً کہتے رہے اسے اگرچہ میں نے بے اتفاقی سے سنا

لیکن وہ غیر شعوری طور پر میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اور اب جب کہ ان جذبات کا طوفان تھم گیا ہے۔ ان کی صداقت ایک ایک کر کے میرے سامنے آ رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے اس سے پہلے بھی جو کچھ کیا تھا کسی ستائش کی تمنا یا صلہ کی امید سے نہیں کیا تھا۔ اب میں، اس جگر خراش واقعہ کے بعد بھی، آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اسی مسلک پر قائم رہوں گا۔ اس حادثہ میں جن دوستوں نے مجھ سے ہمدردی کا ثبوت دیا۔ میں ان سب کا سپاس گذار ہوں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ شکریہ کے مستحق آپ ہیں۔ اس لئے کہ آپ نے اس دشوار گذار راستہ میں میرا ہاتھ اس طرح سے تھاما کہ اس سے میرے پاؤں میں لغزش نہیں پیدا ہونے دی۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو (یہ حادثہ تو گذر ہی جاتا لیکن) میں ایک مختلف انسان ہو جاتا۔ اور یہ نقصان ایسا ہوتا جس کی تلافی کسی صورت میں بھی ممکن نہ تھی۔ آپ کا یہ احسان بہت بڑا احسان ہے۔ اور اس سے بھی بڑا احسان یہ کہ اس ضمن میں آپ نے جن قرآنی حقائق کو بے نقاب کیا۔ ان سے میرا یہ مسلک علیٰ وجہ البصیرت مسلکِ حق و صداقت قرار پا گیا۔

مجھے راشد صاحب سے اسی کی توقع تھی۔ کس قدر بلند ہیں یہ انسان جو قرآن کا اثر اس طرح سے لیتے ہیں۔ قرآن فی الواقع ایسا ہی انقلاب پیدا کرتا ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اور قرآن کی رو سے ہر عمل کا محور یہی نقطۂ توحید ہے کہ جو کچھ کیا جائے للہ کیا جائے۔ یعنی انسانیت کی بلند اقدار کے سرچشمہ سے ہم آہنگی کی خاطر۔ اسی کو ہماری تمام وفاشعاریوں کا مرکز ہونا چاہیئے۔ اس میں کسی معاوضہ اور ستائش کا خیال جذبۂ محرکہ ہونا چاہیئے۔ نہ ہی کسی شخصیت کا پاس۔ خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

سوچو سلیم! کہ کس قدر جنت بداماں ہوگا وہ معاشرہ جس میں فرائض کی انجام دہی کا مرکز یہ تصور ہو۔ اور نوع انسانی کے لئے کس قدر باعثِ رحمت! اور پھر اس پر بھی غور کرو کہ ایک زاویۂ نگاہ کے بدل جانے سے کس طرح خارجی دنیا میں انقلاب واقع ہو جاتا ہے۔ زاویۂ نگاہ کی اسی تبدیلی کا نام قرآن کی اصطلاح میں ایمان ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ ہر عمل کی بنیاد ایمان پر رکھتا ہے تاکہ یہ عمارت اس قدر مستحکم ہو کہ خارجی حوادث اس پر کسی طرح اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اب سمجھے کہ ایمان کسے کہتے ہیں اور اس کا عمل سے کیا تعلق ہے؟

والسلام

پرویز

اکتوبر ۱۹۵۶ء

کیا آپ نے یہ کتابیں دیکھی ہیں؟

جشن نامے ایسے عنوانات جنھیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دورِ آزادی کی کہنی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناسِ رسول یہ کون بتلائے کہ صحیح احادیث کون سی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناسِ رسول۔ مزاج شناسِ رسول کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملیگی۔ قیمت چار روپے

مقامِ حدیث حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جوابات۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے۔

قرآنی دستورِ پاکستان از: پرویز اسمیں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت، علماء اور جماعت اسلامی کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے اسکے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات کا مجموعہ جنھوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

نوادرات از: علامہ اسلم جیراجپوریؒ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ
بڑا سائز ۴۰۰ صفحات قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت از: پرویز مسلمانوں کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات قرآنی آئینہ میں ۱۹۲ صفحات۔ قیمت دو روپے

قرآنی فیصلے روزمرہ کی زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآنی روشنی میں بحث
۴۰۸ صفحات قیمت ۱- چار روپے

اقبال اور قرآن از: پرویز علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفرین مقالات کا مجموعہ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے

اعجاز القرآن از: علامہ تمنا عمادی مدظلہ جس میں مختلف جہات سے قرآن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳-ایل (پی۔ ای۔ سی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی۔ باب یازدہم

(اس پرندے کی کہانی جو پیاس سے بے تاب ہو رہا تھا)

گذشتہ باب کے آخیر میں حضرت علامہ نے کہا تھا کہ میں اپنے مطلب کی وضاحت کہانیوں کے رنگ میں کروں گا۔ چنانچہ اس باب میں انھوں نے دو تین کہانیاں بیان کی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ پختہ اور ناپختہ خودی میں فرق کیا ہوتا ہے۔ پہلی کہانی کی ابتدا یوں ہوتی ہے

طائرے از تشنگی بیتاب بود
در تنِ او دم مثالِ موجِ دود

ایک پرندہ پیاس سے سخت بیتاب ہو رہا تھا۔ تشنگی سے اس کا سینہ پھٹ رہا تھا۔ اس کے جسم میں سانس نہیں بلکہ یوں سمجھئے جیسے آگ سے دھواں اٹھ رہا ہو۔ وہ پانی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا کہ اچانک

ریزۂ الماس در گلزار دید — تشنگی نظارۂ آب آفرید
از فریبِ ریزۂ خورشید تاب — مرغِ ناداں سنگ را پنداشت آب

اس نے باغ میں الماس کا ایک ذرہ دیکھا جو دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس نے شدت پیاس کی وجہ سے اس پتھر کے ٹکڑے کو پانی کا قطرہ سمجھا اور اس کی طرف لپکا لیکن۔

مایہ اندوزِ نم از گوہر نشد
زد بر و منقار و کامش تر نشد

اس سے اس کی پیاس کا بجھنا تو ایک طرف، اس کی چونچ تک نم نہ ہوئی۔ پتھر میں پانی کہاں؟

گفت الماس اے گرفتارِ ہوس — تیز بر من کردہ منقارِ ہوس
قطرۂ آبے نیم۔ ساقی نیم — من برائے دیگراں باقی نیم

الماس نے اس سے کہا کہ اے گرفتارِ ہوس! تو خواہ مخواہ مجھ پر اپنے دانت تیز کر رہا ہے۔ میں قطرۂ شبنم نہیں کہ جس کا جی چاہے مجھے اچک کر لے جائے۔ میں بجائے خویش محکم ہوں۔ میں دوسروں کی مقصد برآری کا آلۂ کار بننے کے لئے نہیں ہوں۔ حضرت علامہ نے یہاں خودی کے متعلق ایک عمیق نقطہ کی تشریح کی ہے۔ خودی (PERSONALITY) خواہ چھوٹی ہو یا خواہ بڑی۔ اس کا کسی دوسری خودی کے ساتھ ذریعہ (MEANS) اور مقصد (END) کا تعلق نہیں ہوتا یعنی کوئی خودی کسی دوسری خودی کے مقصد کے بر لانے کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ خودی کی یہ وہ بنیادی خصوصیت ہے جس میں صحیح آزادی کا راز پنہاں ہے۔ قرآن نے جب کہا ہے کہ ہر بنی آدم محض بنی آدم ہونے کی وجہ سے واجب التکریم ہے۔ اور کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے کتاب و حکومت و نبوت تک بھی کیوں نہ ملی ہو، کہ وہ کسی دوسرے انسان سے کہے کہ تم میری اطاعت کرو۔ تو اس سے خودی کی اسی بنیادی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دنیا آج جمہوریت کے لئے مضطرب و بیقرار پھر رہی ہے۔ لیکن صحیح جمہوریت کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ صحیح جمہوریت کا تصور صرف قرآن سے مل سکتا ہے۔ جس نے ہر فردِ انسانیہ کو اس کی حریت اور شرفِ انسانیت کے تحفظ کی ضمانت دی ہے جس میں ہر فرزندِ آدم پورے حتم و یقین اور اطمینان و سکون سے کہہ سکتا ہے کہ

من برائے دیگراں باقی نیم

یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی رضا و رغبت سے اپنا سب کچھ دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دے اور اگر ضرورت پڑے تو کسی اعلیٰ قدرِ انسانیت کے تحفظ کے لئے اپنی جان تک بھی دیدے۔ لیکن اپنی خوشی سے ایسا کرنے اور دوسروں کے مقاصد کے حصول کا آلۂ کار بن کر ایسا کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خودی کی پختگی کا ثبوت یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے کا آلۂ کار نہیں بنتی۔ اور جس کی خودی پختہ ہو اسے کوئی فنا نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس ریزۂ الماس نے کہا کہ

تصدِ آزارم کنی دیوانہ
از حیاتِ خود نما بیگانہ

تو مجھے تکلیف پہنچانا چاہتا ہے! یہ تیری بھول ہے۔ تو مجھے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ تجھے اس کی خبر ہی نہیں کہ وہ زندگی جس میں خودی کی نمود ہو کس قدر پختہ ہوتی ہے اسے کوئی اذیت نہیں پہنچا سکتی

آبِ من منقارِ مرغاں بشکند
آدمی را گوہرِ جاں بشکند

میں وہ "قطرۂ آب" ہوں جس کی سختی پرندوں کی چونچ توڑ کر رکھ دے۔ پرندے تو ایک طرف! اگر کوئی آدمی بھی مجھے نگل جائے تو اس کی موت واقع ہو جائے۔ مجھے مضم کر لینا کچھ آسان کام نہیں۔

طائر از الماس کامِ دل نیافت
روئے خویش از ریزۂ تابندہ تافت

چنانچہ جب اس پرندہ کی اس طرح مراد بر نہ آئی تو اس نے اس چمکنے والے پتھر سے منہ موڑ لیا۔ پختہ خودی میں ہوتا ہی یہی ہے۔ جو اس کے درپے آزار ہو وہ ناکام نامراد رہ جاتا ہے

حسرت اندر سینۂ اش آباد گشت
در گلوئے او نوا فریاد گشت

پانی کی آرزو اس کے دل اندوہگیں میں حسرتِ ناکام بن کر رہ گئی۔ پیاس کی شدت اور اپنی اس ناکامی سے وہ سرتاپا فریاد بن کر رہ گیا۔

قطرۂ شبنم سرِ شاخِ گلے
تافت مثلِ اشکِ چشمِ بلبلے

اتنے میں وہ کیا دیکھتا ہے کہ شبنم کا ایک قطرہ، پھول کی ٹہنی پر چمک رہا ہے۔ جیسے بلبل کی آنکھ میں آنسو۔

تابِ او محوِ سپاسِ آفتاب
لرزہ بر تن از ہراسِ آفتاب

لیکن اس کی چمک ذاتی نہیں تھی۔ اضافی تھی۔ وہ سورج کی روشنی کی رہینِ کرم تھی۔ اس لئے وہ قطرۂ شبنم سورج سے ہراساں و ترساں تھا۔ دنیا میں ہر اس شخص کی یہی کیفیت ہوتی ہے جو اپنی زلیست یا تابانی کے لئے دوسروں کا محتاج ہو۔ خوف، احتیاج ہی کا دوسرا نام ہے۔

کوکبِ ام خوئے۔ گردوں زادۂ
یک دم از ذوقِ نمود استادۂ

اس قطرۂ شبنم کو پانی کی بوند نہ سمجھو۔ یوں سمجھو کہ یہ آسمان کا ایک ستارہ تھا۔ جس کی زندگی مسلسل خرام میں تھی لیکن وہ ذوقِ نمود سے، اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے، ایک ثانیہ کے لئے متحرک سے ساکن ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرا۔ نہ اس کی چمک دمک باقی رہی نہ سختی اور صلاحیت۔ نہ اس میں حرکت باقی رہی نہ حرارت۔ وہ اپنی تمام خصوصیات کھو بیٹھا۔ اس کی زندگی ہی ختم ہو گئی۔ اس لئے کہ

گردشِ پیہم میں ہے رازِ دوامِ زندگی

جب وہ ستارۂ گردوں اپنا مقام کھو بیٹھا تو اس کی یہ حالت ہو گئی کہ

صد فریب از غنچہ و گل خوردۂ
بہرۂ از زندگی نا بردۂ !!

وہ باغ کے پھول اور کلیوں کے فریب میں آگیا۔ اس نے اس مجموعۂ رنگ و بو کو اصل حیات سمجھ لیا اور اس طرح حقیقی

زندگی سے بے بہرہ ہوگیا۔ حرکت و حرارت سے محروم ہوکر اس کا زندگی میں کوئی حصہ ہی نہ رہا۔ اس نے جب اپنا استحکام ثبات کھودیا تو وہ ستارۂ درخشندہ سے

مثلِ اشکِ عاشقِ دلدادۂ
زیبِ مژگانے چکید آمادۂ

کسی عاشق کی آنکھ کا آنسو بن کر رہ گیا۔ مژگاں کی آرائش کا باعث اور ذرا سی جنبش سے نیچے گرنے کے لئے آمادہ۔ نہ کوئی مقام نہ قیمت۔ چنانچہ

مرغِ مضطر زیرِ شاخِ گل رسید
در دہانش قطرۂ شبنم چکید

وہ پیاسا پرندہ اس پھول کی ٹہنی کے نیچے گیا جس پر یہ قطرۂ شبنم چمک رہا تھا۔ اور ذرا سی دیر میں وہ قطرہ اس کے حلق میں ٹپک پڑا۔

حکایت ختم ہوئی۔ جس مقصد کے لئے یہ حکایت بیان کی گئی تھی۔ وہ اب سامنے لایا جارہا ہے۔ اس کے لئے حضرت علامہ مسلمان سے خطاب کرکے کہتے ہیں کہ

ایکہ می خواہی زدشمن جاں بُری
از تو پرسم قطرۂ یا گوہری

تو چاہتا ہے کہ دشمن کی دست برد سے تیری جان سلامت رہے۔ یہ آرزو بڑی نیک ہے۔ لیکن سوال یہ نہیں کہ تیری آرزو کیسی ہے؟ اصل سوال تو یہ ہے کہ تو خود کیا ہے؟ کیا تو قطرۂ شبنم ہے یا ریزۂ الماس؟ تجھے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ دنیا میں ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر کرتا ہے۔ خواہ اس کے لئے اسے کسی دوسرے کی جان تک بھی لینی کیوں نہ پڑ جائے۔ تم نے نہیں دیکھا کہ

چوں ز سوزِ تشنگی طائر گداخت
از حیاتِ دیگرے سرمایہ ساخت

جب اس پرندے کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تو اس نے اسے بچانے کے لئے قطرۂ شبنم کے وجود کو ختم کر دیا۔ اور اسے اپنے لئے سرمایۂ زیست بنالیا۔ دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے اور ہر فرد کی یہی کوشش رہتی ہے کہ اس کی اپنی زندگی بچ جائے خواہ اس میں کتنوں کی جانیں کیوں نہ چلی جائیں۔ لہٰذا اگر دشمن تمہاری جان کے پیچھے ہے تو اس کا کوئی گلہ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں تمہاری خودی کی حالت کیا ہے۔ اگر یہ ریزۂ الماس کی طرح پختہ ہے۔ تو تمہیں دشمن کا کوئی خوف نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ لیکن اگر یہ قطرۂ شبنم کی طرح از خود رمیدہ ہے تو پھر تمہیں کوئی بچا ہی نہیں

سکتا۔ تم نے خود دیکھ لیا ہے کہ

قطرہ، سخت اندام و گوہر خوبنود
ریزۂ الماس بود و اندبنود

قطرۂ شبنم میں سختی باقی نہیں رہی تھی۔ اس لئے اسے ایک پرندے کی چونچ نے ختم کر دیا۔ اس کے مقابلہ میں الماس میں سختی و صلابیت تھی۔ وہ باقی رہ گیا۔ لہٰذا تمہارے لئے درسِ حیات یہ ہے کہ

غافل از حفظِ خودی یک دم مشو
ریزۂ الماس شو۔ شبنم مشو

تم اپنی خودی کی حفاظت سے ایک ثانیہ کے لئے بھی غافل مت ہو۔ دنیا میں جینا ہے تو ریزۂ الماس بن کر رہو قطرۂ شبنم بن کر نہ رہو۔

پختہ فطرت صورتِ کہسار باش
حاملِ صد ابر و دریا بار باش

تم اپنے اندر پہاڑ کی طرح سختی پیدا کرو کہ اس پر سینکڑوں بادل برس جائیں لیکن اس کا کچھ بھی بگاڑ سکیں۔

بخود خزیدۂ و محکم چو کوہساراں زی
مزی چو خس کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

زندگی کا راز اپنے اندر سختی پیدا کرنے میں ہے۔ اشداء علی الکفار کے یہی معنی ہیں لہٰذا۔

خویش را دریاب از ایجاب خویش
سیم شو از بستنِ سیماب خویش

سلب ایجاب کے معنی نفی و اثبات کے ہیں ۔۔ لہٰذا فلسفۂ خودی کا حاصل یہ ہے کہ تم استحکام و ثباتِ خودی سے اپنے آپ کو پالو۔ اپنے مقام کو پالو۔ خودی جب تک منتشر (DIFFUSED) ہے پارے کی طرح ہے کہ جس برتن میں ڈالو وہ اسی کی شکل اختیار کر لے۔ لیکن اگر اس میں استحکام پیدا کر لو تو وہی پارہ، چاندی کا ٹکڑہ بن جائے گا۔ جو اپنے مقام پر مستحکم و پائیدار رہے گا اور جو اس سے ٹکرائے گا پاش پاش ہو جائے گا۔

نغمہ پیدا کن از تارِ خودی
آشکارا ساز اسرارِ خودی

تیری خودی کے تاروں میں جو نغمے خوابیدہ ہیں تو انھیں بیدار کر۔ اور اس طرح خودی کے پنہاں رازوں کو آشکارا کر دے۔ یہاں پر پہلی حکایت ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد دوسری حکایت سامنے آتی ہے جس کا عنوان ہے۔

الماس و زغال

یعنی ہیرا اور کوئلہ۔ اگر ان دونوں کا کیمیادی تجزیہ (CHEMICAL ANALYSIS) کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی اصل ایک ہی ہے۔ یعنی کاربن۔ وہ ناپختگی کی حالت میں کوئلہ ہوتا ہے اور جب پختہ ہو جاتا ہے تو ہیرا بن جاتا ہے۔ اس حقیقت کو اس حکایت کے انداز میں بیان کیا گیا ہے

از حقیقت باز بکشایم درے
با تو می گویم حدیثِ دیگرے

یہ دوسری حکایت یوں ہے کہ

گفت با الماس در معدن زغال
اے امینِ جلوہ ہائے لازوال

ایک دفعہ کوئلے نے کان میں ہیرے سے کہا کہ اے وہ کہ تیری چمک دمک میں کبھی کمی واقع نہیں ہوتی۔

ہمدمیم و ہست و بود ما یکیست
در جہاں اصلِ وجودِ ما یکیست

ہم دونوں کی اصل بھی ایک ہی ہے۔ اور ایک ہی مقام پر ہم نے زندگی بھی بسر کی ہے۔ پھر یہ کیوں ہے کہ

من بکاں میرم ز دردِ ناکسی
تو سرِ تاجِ شہنشاہاں رسی

میں ان کان کی تاریکیوں میں گمنامی کی زندگی بسر کرتا اور ہیچ میرزی کے عالم میں جیتا ہوں۔ اور تو بادشاہوں کے سر کے تاج کی بلندیوں تک جا پہنچا ہے۔ بالآخر تجھ میں اور مجھ میں فرق کیا ہے اور وہ فرق کیوں ہے ؟

قدرِ من از بدگِلی کمتر ز خاک
از جمالِ تو دلِ آئینہ چاک

میری شکل ایسی بھونڈی ہے کہ اس کی وجہ سے میری قیمت مٹی سے بھی کم ہے۔ اس کے برعکس تیری چمک دمک کا یہ عالم ہے کہ اس سے آئینہ کا دل حسد کے مارے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

روشن از تاریکیٔ من مجمر است
پس کمالِ جوہرم خاکستر است

میری تاریکی صرف انگیٹھی کو روشن کرنے کے کام آتی ہے اور میری ہستی کا مآل راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

پشت پا ہر کس مرا بر سر زند
بر متاعِ ہستیم اخگر زند

میری حالت یہ ہے کہ جسے دیکھو آگ کا انگارہ لئے چلا آرہا ہے۔ اس سے مجھے جلاتا ہے۔ میری ہستی کو نذرِ آتش کر دیتا ہے۔ اور جب ضرورت نہیں رہتی تو مجھے پاؤں تلے روند ڈالتا ہے۔

بر سر و سامانِ من باید گریست
برگ و ساز ہستیم دانی کہ چیست؟

میری زندگی پر ماتم کرنا چاہیئے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میری ہستی عبارت کن اجزا سے ہے؟ معلوم نہ ہو تو سنو کہ

موجۂ دودے بہم پیوستۂ
مایہ دارِ یک شرارِ جستۂ

بس دھوئیں کی ایک موج ہے جو منجمد ہو گئی ہے۔ اور اس کے اندر جلنے کی خاصیت ہے۔ یہ ہیں میرے عناصرِ ترکیبی۔ اس کے مقابلہ میں تو ہے کہ

مثلِ انجم روئے تو۔ ہم خوئے تو
جلوہ ہا خیزد ز ہر پہلوئے تو

تیری شکل و صورت بھی ستاروں جیسی۔ تیری خو بو بھی کوکبِ درخشندہ کی مانند۔ تیرے ہر پہلو سے نور کی شعاعیں جلوہ بار ہوتی ہیں۔

گاہ نورِ دیدۂ قیصر شوی
گاہ زیبِ دستۂ خنجر شوی

کبھی تو شاہنشاہوں کی آنکھ کا تارہ ہوتا ہے۔ کبھی تو نامور بہادروں کی تلوار کے دستہ کی زیب و زینت کا موجب بنتا ہے۔ بزم و رزم دونوں تیری جلوہ آرائیوں سے بقعۂ نور بن جاتے ہیں۔ ذرا مجھے بتاؤ تو سہی کہ مجھ میں اور تجھ میں یہ فرق کیوں ہے؟

گفت الماس اے رفیق نکتہ بیں
تیرہ خاک از پختگی گردد نگیں

ہیرے نے یہ سب کچھ سنا اور اس کے بعد مسکرا کر کہا کہ اے دوست! یہ راز کچھ زیادہ گہرا اور یہ نکتہ کوئی بڑا عمیق نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ اگر تاریک مٹی اپنے اندر پختگی پیدا کرے تو وہ ہیرا بن جاتی ہے۔ اور یہ پختگی حاصل ہوتی ہے مسلسل ٹکراؤ اور تصادم سے پیہم مشکلات کے مقابلہ اور خطرات کا سامنا کرنے سے۔

تا بہ پیرامونِ خود در جنگ شد
پختہ از پیکار مثلِ سنگ شد

یہ مٹی اپنے ماحول سے برسرِ پیکار رہتی ہے۔ اس سے ٹکراتی رہتی ہے۔ اور اسی ٹکراؤ سے اس میں ایسی سختی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ہیرا بن جاتی ہے۔

پیکرم از پختگی ذوالنور شد
سینہ ام از جلوہ ہا معمور شد

یہ محض پختگی کا کرشمہ ہے جس سے میں مجسم نور بن گیا ہوں۔ یہ سختی اور صلابت کا اعجاز ہے جس سے میرا ہر گوشہ رشکِ صد طور ہو گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں تیری یہ حالت ہے کہ

خوار گشتی از وجودِ خام خویش
سوختی از نرمیٔ اندامِ خویش

تو اپنی ناپختگی کے باعث اس قدر ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ تجھ میں چونکہ سختی پیدا نہیں ہوئی۔ نرمی رہی ہے۔ اس لئے ہر شخص تجھے اپنی ضرورت کے لئے جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ اگر تو اپنی اس ذلت کو عزت میں بدلنا چاہتا ہے تو اس کا علاج بہت آسان ہے وہ یہ کہ

فارغ از خوف و غم و وسواس باش
پختہ مثلِ سنگ شو الماس باش

خوف و حزن کو دل سے دور کر دے۔ شک و شبہ کی جگہ ایمان و ایقان پیدا کر۔ اپنی خامی اور نرمی چھوڑ کر پتھر کی طرح سخت ہو جا بس تو بھی میری طرح ہیرا بن جائیگا۔ کوئلہ اور ہیرا آسمان سے بنے بنائے نہیں آتے۔ آسمان سے تو خام مسالہ آتا ہے اس مسالہ سے جو کچھ کوئی بنانا چاہے بن سکتا ہے اگر کوئی اپنے اندر پختگی پیدا کریگا تو ہیرا بن جائیگا۔ نرم خوئی اختیار کریگا تو کوئلہ بنکر رہ جائیگا اور دنیا میں اصول یہ ہے کہ

می شود از وے دو عالم مستنیر   ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر

جو شخص بھی دنیا میں سخت محنت کرتا ہے اور اس کی گرفت سخت ہوتی ہے تو اس میں ایسی چمک پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہر دو عالم روشن ہو جاتے ہیں۔ دنیا اور آخرت کی تاریکیاں، سخت کوشی اور محکم گیری سے چھٹ جاتی ہیں۔

مشتِ خاکے اصلِ سنگِ اسود است   کو سر از جیبِ حرم بیروں زد است
رتبہ اش از طور بالاتر شد است   بوسہ گاہِ اسود و احمر شد است

تم نے حجرِ اسود کو دیکھا ہے جو دیوارِ حرم میں ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا رتبہ طورِ سینا سے بلند ہے۔ وہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے مقامِ احترام ہے۔ ذرا غور تو کرو کہ حجرِ اسود اصل میں ہے کیا؟ ایک مشتِ خاک نے اپنے اندر پختگی پیدا کر کے پتھر بن گئی ہے۔ لہٰذا دنیا میں عزت و احترام کا راز پختگی میں ہے

در صلابت آبروئے زندگی است   ناتوانی۔ ناکسی۔ ناپختگی است

زندگی کی ساری عزت و آبرو، سختی میں ہے جو ناپختہ رہ جاتا ہے۔ وہ ضعیف اور کمزور بھی ہوتا ہے اور بے قدر و قیمت بھی۔
اس شعر پر دوسری حکایت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد تیسری حکایت سامنے آتی ہے۔

انڈس

خوبصورت اور پائیدار شیشہ کے برتنوں کا ضامن ہے

—— ہمارے ہاں ——

ہر قسم کے شیشہ کے ظروف۔ جگ گلاس، برنیاں وغیرہ رنگین وسادہ۔ منقش وپھولدار چمنیاں دگلوب، بوتلیں واسٹیشنری اشیاء وبلاگ گلاس تیار ہوتے ہیں۔

پتہ:- **انڈس گلاس ورکس لمیٹڈ پوسٹ بکس ۵**

گولیمار روڈ —— حیدرآباد (مغربی پاکستان)

طلوع اسلام کا آئندہ شمارہ

کنونشن نمبر ہوگا

جس میں طلوع اسلام کنونشن منعقدہ لاہور کی پوری روئیداد شائع ہوگی اور وہ قراردادیں شائع کی جائیں گی جو اس کنونشن میں پاس کی جائیں گی۔ کنونشن چونکہ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ نومبر کو منعقد ہو رہا ہے۔ اس لئے اس کے بعد ہمارے پاس بہت تھوڑا سا وقت رہ جائے گا۔ اگرچہ ہم ہر ممکن کوشش کریں گے کہ دسمبر کا رسالہ بروقت شائع ہو جائے۔ لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے ممکن ہے کہ رسالہ بروقت شائع نہ کیا جاسکے اور بجائے ۳۰ نومبر کے رسالہ ۵ دسمبر کو پوسٹ کیا جاسکے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کے لئے ہم ناظرین سے پیشگی معذرت خواہ ہیں۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام کراچی

DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
دُوراجلوس
ناخون کی پالش
تزئین حُسن کے لئے
ناخون کی آرائش ضروری ہے
دُوراجلوس
خوش رنگ۔ دیدہ زیب۔ چمکدار اور
خوشبودار پالش ہے۔
امریکہ میں بنی ہوئی
ہر بڑے دوکاندار سے ملتی ہے

حضرت عائشہ رضؓ کی عمر

(شادی کے وقت)

پرویز

ہمارے ہاں جو باتیں متفقہ طور پر مانی جاتی ہیں یعنی جن میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ برس کی اور رخصتی کے وقت نو برس کی تھی۔ اس بات کو ایک ایسے مسلمہ کے طور پر مانا جاتا ہے کہ اس میں کسی تحقیق کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اس کی بنیاد ان روایات پر ہے۔ جو بخاری طبری اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں ملتی ہیں۔ لیکن انہی اور ان جیسی تاریخ کی اور کتابوں میں ایسی روایات بھی موجود ہیں۔ جن سے اس بات کی تردید ہوتی ہے اور اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر اس سے کہیں زیادہ تھی۔

قبل اس کے کہ ہم تاریخ کی روشنی میں اس مسئلہ کی تحقیق کریں۔ دو ایک باتیں تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہیں پہلے تو یہ کہ قرآن کریم میں نکاح وطلاق وغیرہ سے متعلق احکام ہجرت کے بہت بعد نازل ہوئے تھے۔ اور حضرت عائشہؓ کے نکاح اور رخصتی کے واقعات چونکہ ہجرت سے پہلے یا ہجرت کے سال کے بیان کئے جاتے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ یہ قرآنی احکام کے نزول سے پہلے کی باتیں ہیں۔ جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا۔ عربوں میں شادی سے پہلے رشتہ کے متعلق بات طے کر لینے کا رواج تھا۔ یہ وہی چیز تھی جسے ہمارے ہاں نسبت ٹھہرانا یا منگنی کرنا کہتے ہیں۔ قرآن میں صرف نکاح کا ذکر ہے۔ نسبت اور منگنی کا نہیں۔ لہٰذا روایات میں جو کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح چھ برس کی عمر میں ہوا اور رخصتی نو برس کی عمر میں۔ تو وہاں نکاح سے مقصود، عربی معاشرہ کی رسم کے مطابق رشتہ کی بات چیت کا طے پانا (یا منگنی کرنا) ہے اور رخصتی سے مراد شادی۔ بنابریں اصل سوال یہ ہے کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر کیا تھی؟

دوسری بات یہ کہ اس زمانے میں عربوں کے ہاں کوئی خاص کیلنڈر رائج نہیں تھا۔ جس کی رو سے وہ واقعات کا تعین اسی طرح کرتے جس طرح ہم آج تاریخ۔ دن۔ مہینہ اور سن لکھ کر تعین کرتے ہیں (سن ہجری پہلے پہل حضرت عمرؓ کے زمانے میں رائج ہوا تھا) ان کے ہاں پیدائش اور موت کے زمانے کے تعین بعض اہم واقعات کی نسبت سے کرتے یا دوسرے

بچوں کی پیدائش وغیرہ کی نسبت سے۔ خود ہمارے ہاں بھی بڑی بوڑھیاں عمروں کا تعین اسی طرح سے کرتی ہیں۔ مثلاً وہ کہیں گی کہ جب کانگڑے کا بھونچال آیا ہے تو زید دودھ پیتا تھا اور عمر زید سے تین سال بعد پیدا ہوا تھا۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق تاریخ میں ہے کہ حضورؐ کی پیدائش عام الفیل میں ہوئی تھی۔ یعنی اس سال جب یمن کے گورنر نے ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب واقعات کا تعین اس طرح سے کیا جائے تو ان میں مہینوں کا، اور بعض اوقات برسوں کا فرق بھی کچھ مستبعد نہیں ہو سکتا (اس کی مثالیں آخر میں پیش کی جائیں گی) دوسرے یہ کہ پیدائش کے واقعات میں اگر مہینہ نہ دیا جائے صرف سال ہی دیا جائے تو عمر کے حساب میں کم و بیش ایک برس کا فرق ویسے ہی پڑ سکتا ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ فلاں کی پیدائش ۱۹۲۰ء میں ہوئی تھی تو اگر اس کی پیدائش جنوری کے مہینے میں ہوئی تھی تو ۱۹۲۰ء کا سال عمر کے حساب میں شامل کرنا چاہیئے اور اگر پیدائش دسمبر میں ہوئی تھی تو عمر کی ابتداء ۱۹۲۱ء سے ہونی چاہیئے۔ لہٰذا ہماری تاریخ میں عمروں کے حساب کے لئے اس بنیادی نقطہ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

تیسرے یہ کہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) ہمارے ہاں سن کی باقاعدہ ترویج حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی۔ اور اس کی ابتداء ہجرت سے کی گئی۔ اگرچہ ہجرت ربیع الاول کے مہینے میں ہوئی تھی۔ لیکن سن ہجری کو محرم سے شمار کر کے پورا سال لے لیا گیا۔ ہجرت سے پہلے سن کا تعین نبی اکرمؐ کی نبوت کے سال سے کیا جاتا ہے (اگرچہ روایات مختلف ہیں لیکن) اسے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جب حضورؐ عمر کے چالیسویں سال میں تھے تو آپ کو نبوت عطا ہوئی تھی۔ اس کے بعد تیرہ سال تک آپ مکہ میں رہے۔ پھر ہجرت کی۔ یعنی ہجرت کے وقت آپ اپنی عمر کے ۵۳ سال پورے کر چکے تھے اور ۵۴ واں سال شروع تھا۔ اس اعتبار سے (اگر اس سال کو شامل کر لیا جائے جب آپ کو نبوت عطا ہوئی تھی۔ یعنی عمر کا چالیسواں سال تو) ہجرت کے وقت نبوت کا پندرھواں سال ہوگا اور اگر اس پہلے سال کو شامل نہ کیا جائے تو نبوت کا چودھواں سال۔ ان نکات کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کا اثر مسئلہ زیر نظر پر پڑے گا۔

---

(۱) اسد الغابہ جلد چہارم صفحہ ۳۷۷ پر مذکور ہے کہ

حضرت فاطمہؓ، حضرت عائشہؓ سے تقریباً پانچ سال بڑی تھیں۔

لہٰذا حضرت عائشہ کا سن پیدائش معلوم کرنے کے لئے ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ حضرت فاطمہؓ کا سال پیدائش کیا تھا۔

(۲) اسد الغابہ ہی میں ہے کہ

حضرت عباسؓ حضرت علیؓ کے ہاں گئے تو حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ سے کہہ رہی تھیں کہ میری عمر تم سے زیادہ ہے تو اس پر حضرت عباسؓ نے کہا کہ فاطمہؓ اس زمانے میں پیدا ہوئی تھیں جب قریش خانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے اور علیؓ اس سے چند سال پہلے پیدا ہو چکے تھے (جلد چہارم صفحہ ۲۸۰)

اسی کتاب میں دوسرے مقام پر ہے کہ

حضرت فاطمہؓ کی پیدائش اس سال میں ہوئی تھی جبکہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اور نبی اکرمؐ کی عمر ۳۵ سال کی تھی۔ (جلد چہارم صفحہ ۳۷۷)

طبقات ابن سعد میں ہے

حضرت فاطمہؓ، رسول اللہؐ کی بیٹی ہیں۔ ان کی والدہ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی ہیں۔ حضرت فاطمہؓ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ان دنوں پیدا ہوئی تھیں جب قریش بیت اللہ کی تعمیر کر رہے تھے اور یہ واقعہ نبوت سے پانچ سال پہلے کا ہے۔

(جلد ۸ صفحہ ۱۱)

دوسری جگہ ہے۔

حضرت عباسؓ ایک مرتبہ حضرت علیؓ کے گھر گئے تو حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ سے فرما رہی تھیں کہ میں تم سے عمر میں بڑی ہوں۔ حضرت عباسؓ نے فرمایا۔ دیکھو فاطمہؓ! تم ان دنوں پیدا ہوئی تھیں جبکہ قریش خانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے۔ اور نبی اکرمؐ کی پینتیس سال کی عمر تھی اور دیکھو علی! تم اس سے چند سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ (جلد ۸ صفحہ ۱۷)

استیعاب میں حضرت فاطمہؓ کی وفات کے متعلق حسب ذیل بیان ملتا ہے۔

وفات کے وقت حضرت فاطمہؓ کی عمر کیا تھی؟ اس میں اختلاف ہے۔ زبیر بن بکار نے عبداللہ بن الحسن بن الحسن سے نقل کیا ہے کہ وہ ہشام بن عبدالملک کے پاس تھے۔ اور وہاں کلبی بھی موجود تھے۔ ہشام نے عبداللہ بن الحسن سے دریافت کیا کہ اے ابو محمد! فاطمہؓ بنت رسول اللہؐ کی عمر کل کتنی ہوئی تھی۔ تو عبداللہ بن الحسن نے کہا کہ تیس سال۔ اس کے بعد ہشام نے کلبی سے دریافت کیا کہ حضرت فاطمہ کی کل عمر کتنی ہوئی تو کلبی نے کہا کہ ۳۵ سال۔ اس پر ہشام نے عبداللہ ابن الحسن سے کہا کہ اے ابو محمد! سنئے کلبی کیا کہہ رہے ہیں۔ اور ہشام نے کلبی کے بیان کو زیادہ اہمیت دی[1]۔ اس پر عبداللہ ابن الحسن نے کہا۔ اے امیر المومنین! مجھ سے میری ماں کے متعلق پوچھئے اور کلبی سے اس کی ماں کے متعلق دریافت کیجئے (جلد ۲ صفحہ ۷۵۲)

حضرت فاطمہؓ کی وفات ۱۱ھ میں ہوئی تھی۔ اگر اس وقت ان کی عمر تیس سال کی تھی تو اس سے ان کی پیدائش نبوت سے قریب پانچ سال پہلے ٹھیک بیٹھتی ہے (مہینوں کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیئے)

اس میں شبہ نہیں کہ (دیگر واقعات کی طرح) حضرت فاطمہؓ کی عمر (بوقت وفات) کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں مثلاً

[1] آخر میں ایک اور روایت بھی ملاحظہ کیجئے۔

ایک روایت کی رو سے ان کی عمر چوبیس سال کی ہوتی ہے۔ حتکہ ایک کی رو سے اٹھارہ سال سے کچھ زیادہ۔ لیکن صحیح یہی نظر آتا ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمر قریب تیس سال تھی۔ اور پیدائش نبوت سے قریب پانچ سال پہلے۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ اس سال پیدا ہوئیں جب کہ نبی اکرمؐ اپنی عمر کے چالیسویں سال میں تھے (حضرت فاطمہؓ کی پیدائش سے قریب پانچسال بعد) یعنی اس سال جب حضورؐ کو نبوت ملی۔ (آخر میں ایک اور روایت بھی دیکھئے)

(۳) اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح (منگنی) کے وقت چھ برس کی تھی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ان کی پیدائش ۴ سنہ نبوی میں (یعنی حضور کو نبوت ملنے کے چوتھے سال۔ یا جب حضورؐ کی عمر چوالیس سال کی تھی اس وقت) ہوئی تھی۔ اس لئے کہ نکاح (منگنی) کا واقعہ ۱۰ سنہ نبوی کا بتایا جاتا ہے۔ یعنی جب حضورؐ کی عمر پچاس سال کی تھی۔ یہ بات بوجوہ غلط ہے۔ مثلاً طبقات ابن سعد میں ہے کہ

> جب رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکر کو حضرت عائشہؓ کا پیغام دیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں عائشہ کے متعلق مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف سے اس کے بیٹے جبیر کے لئے وعدہ یا بات چیت کر چکا ہوں۔ لہذا مجھے اتنی مہلت دیجئے کہ میں عائشہؓ کو ان سے واپس لے لوں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایسا ہی کیا۔
>
> (جلد ۸ صـ ۳۹)

اگر حضرت عائشہ کی عمر اس واقعہ کے وقت چھ برس کی تسلیم کی جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ جبیر سے ان کی منگنی چار پانچ سال کی عمر میں ہو چکی تھی۔ عربوں میں اس کی مثال کہیں نہیں ملتی کہ وہ چار چار یا پانچ پانچ سال کی عمر کی لڑکیوں کی نسبت کر دیا کرتے تھے۔ علاوہ بریں بخاری میں ہے کہ

> حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جب نبی اکرمؐ پر مکہ میں بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَأَمَرُّ (سورۃ القمر کی) آیات نازل ہوئیں تو میں ان دنوں بچی تھی اور کھیلتی پھرتی تھی۔ (بخاری جلد ۲۔ صـ ۲۰۴)

سورہ قمر قریب ۵ سنہ نبوی میں نازل ہوئی تھی۔ اُس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر کم از کم اتنی تو ہونی چاہیئے کہ انہیں معلوم ہو کہ یہ قرآن کی آیات ہیں۔ اور بعد میں یہ واقعہ یاد بھی رہے۔ اگر ان کا سال پیدائش ۴ سنہ نبوی تصور کر لیا جائے تو ۵ سنہ نبوی میں وہ ایک سال کی ہوئیں۔ ایک سال کی بچی کے لئے نہ کھیلنا پھرنا ممکن ہے۔ نہ قرآنی آیات کے متعلق یہ کچھ یاد رکھنا ممکن۔ اس کے برعکس اگر ان کا سن پیدائش نبوت کا پہلا سال تسلیم کیا جائے تو سورۂ قمر کے نزول کے وقت ان کی عمر پانچ چھ سال کی ہوگی۔ اس عمر میں وہ یقیناً کھیلتی پھرتی ہوں گی۔ اور قرآنی آیات کے متعلق یہ کچھ یاد رکھ سکنے کے قابل۔ (اس ضمن میں وہ روایت بھی قابل غور ہے جو آخر میں درج کی گئی ہے)

ان شہادات سے بھی واضح ہے کہ یہی روایت قابلِ ترجیح ہے کہ ان کی پیدائش اسی سال ہوئی جب رسول اللہؐ اپنی عمر کے چالیسویں سال میں تھے۔

---

(۴) جس واقعہ کو نکاح یا منگنی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ شوال سنہ نبوی میں ہوا تھا (طبقات ابن سعد جلد ۸ صفحہ) جب حضورؐ کی عمر پچپن سال کی تھی۔ اس اعتبار سے حضرت عائشہؓ کی عمر اس وقت دس سال کے قریب تھی۔ اگر پہلا سال شمار نہ کیا جائے اور گیارہ سال کی اگر اسے شمار کر لیا جائے۔ چونکہ اصل اہمیت شادی کے واقعہ کو ہے نہ کہ منگنی کے واقعہ کو۔ اس لئے ہم اس واقعہ کے سرسری تذکرہ کے بعد آگے بڑھتے ہیں۔

---

(۵) شادی کے متعلق اس امر پر اتفاق ہے کہ وہ ہجرت کے بعد ہوئی تھی۔ سو ہمیں پہلے یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ ہجرت کب ہوئی تھی۔

نزولِ وحی کے بعد نبیؐ اکرم مکہ میں کتنے سال رہے۔ اس کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ جب آپ پر وحی نازل ہوئی ہے تو آپ کی عمر تینتالیس سال کی تھی۔ اور اس کے بعد آپ دس سال تک مکہ میں رہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ

> ایک شخص حضرت ابن عباسؓ کے پاس آیا۔ اور کہا کہ رسولؐ اللہ پر دس برس کے میں اور دس برس مدینہ میں وحی نازل کی گئی۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ یہ کون کہتا ہے۔ مکہ میں آپ پر پندرہ برس تک یا اس سے زیادہ وحی کی گئی

لیکن انہی (حضرت ابن عباسؓ) سے یہ روایت بھی ہے کہ آپ مکہ میں تیرہ برس رہے۔ چنانچہ اس بات کو عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ آپ تیرہ برس مکہ میں رہے اس کے بعد ہجرت فرمائی۔ (ان روایات کے لئے دیکھئے طبقات ابن سعد جزو اول صفحہ ۳۳۲-۳۴ تاریخ طبری۔ جلد اول۔ حصہ سوم صفحہ ۱۲۵-۱۲۶۔ اتفاق سے اس وقت میرے سامنے ان جلدوں کا اردو ترجمہ ہے جو حیدرآباد دکن سے شائع ہوا تھا۔ اس لئے یہ دونوں حوالے اس کے ہیں) تیرہ سال اور پندرہ سال کے تضاد کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ رسول اللہؐ اپنی عمر کے ۵۳ سال پورے کر چکے تھے اور ۵۴ واں سال شروع ہوا تھا جب ہجرت ہوئی۔ اور حضورؐ چالیسویں سال میں تھے کہ نزولِ وحی کی ابتدا ہوئی۔ اب اگر عمر کا چالیسواں سال شمار نہ کیا جائے تو مکہ کا قیام تیرہ برس کا ہوتا ہے اور چودھویں برس کے شروع میں ہجرت ہوتی ہے اور اگر چالیسویں سال کو شمار کر لیا جائے تو مکہ کا قیام چودہ سال کا ہوتا ہے اور پندرھویں سال میں ہجرت ہوتی ہے۔ اسی کو غالباً حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں پندرہ سال کہہ دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت عائشہؓ شروع ہجرت میں یا تو تیرہ سال پورے کر کے چودھویں سال میں تھیں اور یا

چودہ سال پورے کر کے پندرھویں سال میں۔ (نیز دیکھئے وہ روایت جو آخر میں آئی ہے)

---

(۶) اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہجرت کے کتنے عرصہ بعد آپ کی شادی ہوئی۔ عام روایت کے مطابق نکاح (منگنی) کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ برس کی تھی اور رخصتی (شادی) کے وقت نو برس کی۔ اور رخصتی مدینہ میں شوال کے مہینے میں ہوئی تھی چونکہ منگنی ہجرت سے تین سال پہلے ہوئی تھی۔ اس لئے اس روایت کے مطابق آپ کی شادی ہجرت کے پہلے سال ماہ شوال میں ہو جانی چاہیئے۔ لیکن یہ بھی غلط ہے۔ اس کے وجوہات حسب ذیل ہیں۔

(ا) طبقات ابن سعد میں حضرت عائشہؓ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ جب نبی اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ مدینہ تشریف لے گئے تو حضورؐ کی صاحبزادیاں اور حضرت ابوبکرؓ کے اہل و عیال مکہ میں پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد جب آپ کو اطمینان ہو گیا تو ان سب کو مدینہ بلوالیا گیا۔ (طبقات جلد ۸۔ صفحہ ۴۳)

(ب) بخاری میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ

> جب ہم مدینہ آئے تو مجھے وہاں بخار آیا اور میرے سر کے تمام بال جھڑ گئے۔ اس کے بعد وہ پھر اُگ آئے اور کندھوں تک آ گئے تب آپ کی شادی ہوئی۔

(بخاری جزو ۱۵ صفحہ ۷۱)

اس سے ظاہر ہے کہ

(i) حضرت عائشہؓ ہجرت کے کچھ عرصہ بعد تک مکہ ہی میں رہیں (واضح رہے کہ ہجرت ربیع الاول کے مہینے میں ہوئی تھی)

(ii) مدینہ تشریف لانے کے بعد آپ بیمار ہوئیں اور آپ کے سر کے بال سب جھڑ گئے

(iii) اس کے بعد وہ تمام بال دوبارہ اُگے اور کندھوں تک آ گئے۔ اس کے بعد آپ کی شادی ہوئی۔

اگر یہ مانا جائے کہ آپ کی شادی ہجرت کے پہلے سال شوال میں ہوئی تھی۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اوپر کے تمام واقعات آٹھ ماہ کے اندر اندر (ربیع الاول سے شوال تک) ہو گئے تھے۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ آپ کو ہجرت کے بعد مکہ سے مدینہ آنے میں تین چار ماہ کا عرصہ لگا۔ پھر ایک آدھ مہینہ بیماری کا بھی سمجھ لیجئے تو اس کے بعد شادی تک کے لئے تین چار ماہ کا عرصہ باقی رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے قلیل عرصہ میں کسی صورت میں بھی نئے بال اُگ کر کندھوں تک نہیں آ سکتے۔ یہ ایک ایسی بدیہی بات ہے کہ بخاری کے شارح عینی نے بھی لکھا ہے کہ

> یہ قول بہت ہی عجیب ہے کہ ان کی رخصتی ہجرت کے سات مہینے بعد ہوگئی۔ یہ قول بالکل کمزور

ہے۔ ان کی رخصتی جنگ بدر سے واپسی کے بعد شوال سنہ ۲ ہجری میں ہوئی۔

(عینی جلد ۸۔ صفحہ ۹۶)

(ج) اس کی تائید استیعاب نے بھی کی ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ

رسول اللہؐ نے حضرت عائشہ سے ہجرت سے تین سال پہلے شوال سنہ ۱۰ نبوی میں نکاح کیا تھا اور ہجرت سے اٹھارہ ماہ بعد شوال میں مدینہ میں انہیں رخصت کرا کر لائے تھے (استیعاب جلد ۲ صفحہ ۷۴۴)

(د) اسد الغابہ میں ہے کہ

حضرت فاطمہ کی شادی، حضرت عائشہ کی شادی کے چار ماہ بعد ہوئی تھی۔ (جلد ۵ صفحہ ۵۲۰)

حضرت فاطمہؓ کی شادی محرم میں ہوئی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کس سن ہجری کا محرم تھا۔ بخاری میں ایک طویل روایت ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میری ایک اونٹنی تھی جو مجھے یوم بدر میں مال غنیمت میں ملی تھی۔ اور ایک اونٹنی مجھے رسول اللہؐ نے اس حصہ میں سے دی تھی جو اللہ نے آپ کو بطور فے دیا تھا۔ یعنی خمس میں سے۔ میں نے ارادہ کیا کہ حضرت فاطمہؓ بنت رسول اللہؐ کو رخصت کرا کر لے آؤں اور میں نے بنو قینقاع کے ایک سنار سے بات چیت کی کہ وہ میرے ساتھ چلے اور ہم چل کر اذخر گھاس لے آئیں۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ اذخر گھاس کو سناروں کے ہاتھ فروخت کروں گا اور اس سے جو رقم مجھے حاصل ہو گی اس سے اپنی شادی کا ولیمہ کروں گا (اس کے بعد ہے کہ حضرت حمزہ نے کس طرح ان اونٹنیوں کی کوکھیں پھاڑ ڈالیں۔ چونکہ یہ حصہ ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے اسلئے اسے نقل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔) (بخاری جزو سوم۔ صفحہ ۵)

اس سے ظاہر ہے کہ جنگ بدر تک حضرت علی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جنگ بدر رمضان سنہ ۲ھ میں ہوئی۔ لہذا آپ کی شادی جلدی سے جلدی سنہ ۳ھ کے محرم میں ہو سکتی ہے (اسد الغابہ میں اسے غلطی سے محرم سنہ ۲ھ لکھ دیا گیا ہے)

اور چونکہ حضرت عائشہؓ کی شادی اس سے چار ماہ قبل ہوئی تھی اس لئے یہ شادی شوال سنہ ۲ھ میں ہو سکتی ہے نہ کہ سنہ ۱ھ میں۔

---

(۷) تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ شادی کے وقت حضرت عائشہ کی عمر پندرہ برس کی تھی اگر سال پیدائش کو شمار نہ کیا جائے۔ اور سولہ برس کی اگر اس سال کو شمار کر لیا جائے۔ یعنی ہجرت کے وقت کی عمر سے قریب دو سال زیادہ۔ حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت پہلے درج کی جا چکی ہے کہ حضورؐ نزول وحی کے بعد پندرہ سال تک مکہ میں رہے اس مقام پر ہم نے تیرہ اور پندرہ سال کی روایات میں مطابقت کی کوشش کی تھی۔ لیکن اگر اس روایت کو بالفاظہٖ صحیح مان لیا جائے (کہ حضورؐ نے مکہ میں کامل پندرہ سال رہنے کے بعد سولہویں برس میں ہجرت کی) تو اس صورت میں حضرت عائشہ کی عمر بوقت شادی

سترہ سال کی ہو جاتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کی تائید طبری کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ

ابن عباس اور ابن حنظلہ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے پینسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی

(طبری اردو ترجمہ حیدرآباد۔ جلد اول۔ حصہ سوم۔ ص۵۹۹)

یعنی چالیس سال کی عمر میں نبوت۔ پندرہ سال مکہ میں۔ اور دس سال مدینہ میں۔ کل پینسٹھ سال۔

ان شہادات کے علاوہ ایک اور شہادت ایسی ہے جو واقعہ کے لحاظ سے ان سے بھی قوی ہے اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر ہجرت کے وقت سترہ (۱۷) سال کی، فلہٰذا رخصتی کے وقت قریب انیس (۱۹) سال کی تھی۔ حضرت اسماءؓ بنت حضرت ابوبکرؓ حضرت عائشہؓ کی بڑی (علاتی) بہن تھیں۔ ان کے متعلق صاحبِ مشکوٰۃ شیخ ولی الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ خطیب اپنی کتاب اکمال فی اسماء الرجال میں لکھتے ہیں۔

یہ اسماء ہیں ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی۔ ان کو ذات النطاقین کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے جس رات میں حضورؐ نے ہجرت کی تھی اپنے پٹکے کو پھاڑ کر دو حصے کئے تھے۔ اسکے ایک حصہ میں توشہ دان کو باندھا اور دوسرے کو مشکیزے پر باندھا یا اس کا اپنا پٹکا بنا لیا تھا۔ اور یہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی والدہ ہیں۔ کہ میں اسلام لائیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت صرف سترہ آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور یہ حضرت عائشہؓ سے دس برس بڑی تھیں۔ جب آپ کے بیٹے عبداللہ بن زبیر کی نعش کو (جو بعد قتل ایک لکڑی پر لٹکا دی گئی تھی) لکڑی سے اتار کر دفن کیا گیا۔ اس سے دس دن بعد یا بیس دن بعد بعمر ایک سو سال انتقال کیا۔ اُس وقت ۷۳ھ تھا۔ ان سے بہت سے لوگوں نے احادیث کی روایت کی ہے۔

(اکمال، مشکوٰۃ کے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس کا ص۴۷۲ دیکھئے[1])

حضرت اسماءؓ کی عمر بوقت وفات (۷۳ھ میں) سو سال کی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی عمر ہجرت کے وقت ۲۷ (ستائیس) سال کی تھی۔ اور چونکہ حضرت عائشہؓ ان سے دس سال چھوٹی تھیں۔ اس لئے حضرت عائشہؓ کی عمر سترہ سال کی تھی۔ اس اعتبار سے شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر قریب انیس (۱۹) سال کی ہوتی ہے۔

اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ کلبی نے جو ہشام بن عبدالملک سے کہا تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی عمر قریب پینتیس سال کی تھی تو یہ قرین قیاس تھا۔ اگر حضرت عائشہ کی عمر ہجرت کے وقت سترہ سال کی تھی تو حضرت فاطمہؓ کی عمر اُس وقت قریب بائیس

---

[1] میرے عزیز دوست بشیر احمد سوی صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت اسماء کے یہ تمام حالات، تجرید بخاری (مطبوعہ دین محمد اینڈ سنز) کے ص۱۷۰ پر بھی درج ہیں۔

سال کے ہوگی۔ اور وفات کے وقت قریب تینتیس (۳۳) سال۔ اور پیدائش اور وفات کے سال ساتھ شمار کر لینے سے پینتیس (۳۵) سال۔

بہر حال تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر بعض روایات کے مطابق انیس برس اور بعض کے مطابق سترہ برس کی تھی۔ اور ۱۵/۱۶ برس سے کم کسی صورت میں بھی نہ تھی۔ اس لئے وہ روایات کہ شادی کے وقت آپ کی عمر نو برس کی تھی۔ آپ اس وقت بچیوں کے ساتھ جھولے جھولتیں اور (نبی اکرمؐ کے ہاں آجانے کے بعد بھی) گڑیاں کھیلا کرتی تھیں قابلِ قبول قرار نہیں پا سکتیں۔ رسول اللہؐ نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں۔ ان میں سے کسی کی شادی بھی صغر سنی میں نہیں کی۔ سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ کی شادی کی۔ اس وقت ان کی عمر کم از کم ۲۱/۲۲ سال کی تھی۔ حالانکہ حضرت علیؓ جن سے ان کی شادی کرنی تھی۔ خود گھر میں موجود تھے۔

آخر میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں تاریخ کے متعلق اس اہم نقطہ کو ایک بار پھر دہراؤں جسے اس سے بیشتر کئی مرتبہ پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تاریخ میں ہمیں ایک ہی واقعہ کے متعلق کئی متضاد روایات ملتی ہیں۔ مثلاً طبری میں خود نبی اکرمؐ کی عمر کے متعلق یہ روایات موجود ہیں کہ آپ کی عمر ساٹھ سال کی، تریسٹھ سال کی، یا پینسٹھ سال کی تھی (طبری جلد اول حصہ سوم) یا مثلاً حضرت فاطمہؓ کی وفات کے متعلق ہے کہ وہ حضورؐ کی وفات کے بعد صرف تین دن زندہ رہیں۔ یا ایک ماہ۔ دو ماہ۔ تین ماہ اور پانچ دن، چار ماہ۔ بعض کے نزدیک چھ ماہ تک زندہ رہیں (بحوالہ سیرۃ النبی شبلی جلد دوم ص۲۴۴ حاشیہ) یہ فرق تو پھر بھی چند دنوں اور مہینوں کا ہے۔ حضرت سودہؓ کی وفات کے متعلق واقدی نے لکھا ہے کہ انہوں نے ۵۴ھ میں وفات پائی اور امام بخاری تاریخ میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں انتقال فرمایا (یعنی ۲۳ھ سے پہلے)۔ اس فرق کو ملاحظہ کیجئے کہ کس قدر زیادہ ہے۔ یہ تضاد جہاں تک ان واقعات میں ہے جن کا تعلق کسی دینی معاملے سے نہیں اور نہ ہی ان کا اثر نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر پڑتا ہے ان میں چنداں مضائقہ نہیں کہ ایک روایت کو قبول کر لیا جائے یا دوسری کو۔ مثلاً یہ کہ حضرت سودہؓ کی وفات ۲۳ھ میں ہوئی تھی یا ۵۴ھ میں۔ اس کا اثر نہ دین پر پڑتا ہے اور نہ رسول اللہؐ کی ذاتِ اقدس پر۔ لیکن ایسی روایات جن کا اثر دین پر یا حضورؐ کی ذات پر پڑتا ہو۔ ان کے متعلق بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ان کے بارے میں اصول یہ ہونا چاہیئے کہ کوئی بات جو قرآن کے خلاف ہو یا جس سے حضورؐ کی ذات کے خلاف کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہو وہ کسی صورت میں صحیح نہیں ہو سکتی۔ خواہ تاریخی اسناد کی رو سے وہ کتنی ہی ثقہ کیوں نہ قرار پا چکی ہو۔ تاریخ بہر حال ظنی ہے۔ اس کے مقابلہ میں قرآن ایک یقینی شہادت ہے۔ اور یہ حقیقت بھی قطعاً یقینی ہے کہ نبی اکرمؐ کا کوئی قول یا عمل نہ قرآن کے خلاف ہو سکتا تھا اور نہ ہی شرفِ انسانیت کے خلاف۔ اس لئے ہمیں ظنی چیزوں کو ہمیشہ یقینی باتوں کے تابع رکھنا چاہیئے۔ اگر ہم اپنی تاریخ میں اتنی احتیاط برت لیں تو ہم دین کے معاملہ میں بہت سی الجھنوں سے بچ جائیں گے۔ اور سیرت نبی اکرمؐ کے بارے میں ان رنجدہ اعتراضات سے جو ہماری تاریخی روایات کی بنا پر غیروں کی طرف سے آئے دن عاید ہوتے رہتے ہیں۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ صدر اول کی تاریخ مذکورہ بالا معیار کے مطابق از سر نو لکھی جائے تاکہ جن غلط واقعات کی بنا پر نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار ہو جاتی ہے وہ واقعات تاریخ میں باقی ہی نہ رہیں۔ لیکن جب تک ایسا نہ ہو سکے اس وقت تک ہمیں اتنا تو ضرور کرنا چاہیئے کہ اس قسم کی روایات کے متعلق کہہ دیا جائے کہ یہ غلط ہیں اور مزید تحقیق کی محتاج۔

؎ بحوالہ سیرۃ النبی شبلی۔ جلد دوم۔ ص۲۴۴

قرآن کریم کے قدیم نسخے

[ماہنامہ "ثقافت" لاہور کی ستمبر کی اشاعت میں محترم قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی کا ایک مقالہ "مصاحفِ قرونِ ثلاثہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جسے ہم بہ تبدیلی عنوان ذیل میں درج کرتے ہیں۔ بہ شکریہ "ثقافت"۔　　طلوعِ اسلام]

حضور انور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سب سے بہتر میرا زمانہ ہے۔ پھر اس کے بعد کا پھر اسکے بعد کا۔ گویا یہ تین زمانے ہیں جن کو اصطلاحِ اسلام میں قرونِ ثلاثہ کہا جاتا ہے۔ ان تین زمانوں کی تفصیل اس طرح ہے۔ قرنِ اول عہد رسالت و عہد صحابہ سنہ ۱۱ھ ہجری تک۔ قرنِ دوم عہد تابعین سنہ ۱۷۰ھ ہجری تک۔ قرنِ سوم عہد تبع تابعین سنہ ۲۲۰ھ تک لیکن حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی المتوفی سنہ ۱۰۵۲ھ نے قرنِ ثالث کو سنہ ۲۷۶ھ تک وسعت دی ہے۔ ذیل میں ہم اسی دور کے مرقومہ مصاحف پر روشنی ڈالیں گے۔

حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلی وحی ۱۷ رمضان المبارک روز دوشنبہ مطابق ۲۸ جولائی سنہ ۶۱۰ء کو ہوئی اس سال کو ہم سالِ نبوی کہتے ہیں۔ اس وحی میں تبلیغ کا حکم نہ تھا۔ ڈھائی برس کے بعد یعنی بروز دوشنبہ ربیع الاول سنہ ۴ نبوی کو دوسری وحی نازل ہوئی۔[1] اس میں تبلیغ کا حکم تھا۔ آپ نے تبلیغ شروع کی۔ حضرت ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا اسی دن مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ اگلے روز یعنی سہ شنبہ کو حضرت علی، حضرت زید بن حارثہ، حضرت ابوبکر مسلمان ہوئے۔ پنجشنبہ کو حضرت خالد بن سعید ایمان لائے۔ اس وقت تک چند آیات سورۂ علق کی اور چند آیات سورۂ مدثر کی نازل ہوئی تھیں۔ اسی دن سے حضورؐ نے کتابتِ وحی کا آغاز کرایا۔ چنانچہ اُم خالد بنت خالد بن سعید بن ابی العاص نے کہا کہ اول بسم اللہ میرے باپ نے لکھی (استیعاب جلد اول) اس کے بعد جو لوگ مشرف باسلام ہوتے تھے ان میں سے کچھ لوگ اپنے لئے قرآن لکھتے تھے چنانچہ حضورؐ کی حیات میں قرآن کے متعدد لکھے ہوئے نسخے موجود تھے۔ حضورؐ نے ایک جگہ قرآن کے کچھ نسخے لکھے ہوئے دیکھے تو فرمایا صرف یہی کافی نہیں۔ خدا ایسے شخص کو عذاب دے گا جسے قرآن یاد ہو (کنزالعمال) مطلب یہ ہے کہ تحریر کے بھروسہ پہ

---

[1] یہ تاریخی واقعات ہیں قرآن میں اس کا ذکر نہیں۔　　طلوعِ اسلام

قرآن کو حفظ کرنا نہ چھوڑ دینا۔ ایک سفر میں مکہ و مدینہ کے درمیان ایک شخص نے حضورؐ سے آکر عرض کیا کہ میرا قرآن کا ایک جزو گم ہو گیا ہے (کتاب المصاحف) حضورؐ نے قرآن کو دشمنوں کے ملک میں لے جانے سے منع فرمایا (بخاری کتاب الجہاد) بعض جلیل القدر صحابہ نے کئی کئی بار قرآن لکھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے چار مرتبہ لکھا۔ عرب کے مشہور شاعر لبید جب مسلمان ہو گئے تو قرآن نویسی کا شغل اختیار کیا۔ خدا جانے عمر میں کتنے قرآن لکھے ہوں گے (جمہرۃ العرب) ناجیۃ الطفاوی صحابی بھی قرآن ہی لکھا کرتے تھے (استیعاب قسم دوم حصہ اول) امہات المومنین ام سلمہؓ۔ حفصہؓ۔ عائشہؓ نے قرآن لکھا ہے (کنز العمال) حضرت عائشہؓ نے اپنے آزاد کردہ غلام ابو یونس سے قرآن لکھایا (ترمذی) عمرو بن رافع نے حضرت حفصہؓ کے لئے قرآن لکھا (تیسیر الاصول) مختلف کتب حدیث و تاریخ میں مشاہیر میں سے انتیس صحابہ کے قرآن جمع کرنے اور مکمل لکھنے کا ذکر ہے۔ محققین مذاہب غیر نے بھی بعد تحقیق اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ حضورؐ کے عہد میں بہت سے قرآن لکھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر راڈویل لکھتے ہیں کہ قرآن کے لکھے ہوئے نسخے عہد رسول میں عام طور پر زیر استعمال تھے (انگریزی ترجمہ قرآن) سر ولیم میور نے لکھا ہے کہ اس بات کے ماننے کے زبردست وجوہ موجود ہیں کہ رسول کی زندگی میں متفرق طور پر قرآن کے لکھے ہوئے نسخے صحابہ کے پاس موجود تھے۔ اور ان نسخوں میں پورا قرآن یا تقریباً تمام قرآن لکھا ہوا موجود تھا (دیباچہ لائف آف محمدؐ)

قرآن مجید میں بھی اس کی کتابت کے متعلق متعدد اندرونی شہادتیں موجود ہیں قال اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملی علیہ بکرۃ واصیلا۔ مطلب یہ ہے کہ کافر کہتے تھے کہ یہ تو پرانے قصے ہیں۔ جن کو نبی لکھاتا ہے اور لوگ لکھتے ہیں۔[1]

یہ تو معلوم ہے کہ اس زمانے میں دنیا میں کہیں پریس و مطابع نہ تھے۔ صرف ہاتھ سے لکھنے کا دستور تھا۔ اور یہ بھی ایک عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز بہتر صورت میں آ جاتی ہے تو قدیم کی حفاظت لوگ نہیں کرتے۔ تاریخ یہ بھی گواہی دیتی ہے کہ عالم اسلام پر بڑے بڑے سخت زمانے گذرے ہیں۔ قتل عام ہوئے۔ گھر اور کتب خانے۔ سرکاری دفاتر لوٹے گئے۔ جلائے گئے۔ ان صورتوں میں قدیم تحریرات کا باقی رہنا مشکل تھا۔ اس لئے اس عہد کا کوئی مرتومہ نسخہ قرآن مجید کا موجود نہیں ہے۔

مصاحفِ عہد خلافتِ اول:۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جو قرآن دفتر خلافت کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس کو مصحف ام کہتے تھے۔ وہ تا حیات حضرت ابوبکر کے پاس رہا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو ان کے پاس رہا۔ شہادت عمرؓ کے بعد ان کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس رہا۔ ان کی وفات کے بعد مروان بن الحکم گورنر مدینہ نے یہ نسخہ لے لیا جو ۶۶ھ میں ایک سفر میں اُس کے پاس سے گم ہو گیا۔

امام ابن حزم نے لکھا ہے کہ خلیفہ اول کے عہد میں کوئی شہر ایسا نہ تھا۔ جہاں لوگوں کے پاس بکثرت قرآن نہ ہوں (کتاب الفصل الملل والنحل جلد دوم) اس عہد کے حسب ذیل مشہور مصاحف کا تذکرہ بخاری، نسائی، مسند امام احمد بن حنبل، کنز

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ "قرآن کریم روایات کے آئینہ میں" مشمولہ "مقام حدیث" جلد دوم۔ شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام۔ (طلوع اسلام)

العمال، جمہرۃ اللغۃ، تہذیب التہذیب، طبقات ابن سعد، فتح الباری، خلاصۃ البیان احمد جودت آفندی میں ہے۔

(۱) مصحف عثمانؓ بن عفان (۲) مصحف علیؓ بن ابی طالب (۳) مصحف عبداللہ بن مسعود (۴) مصحف ابی بن کعب (۵) مصحف ابوزیدؓ (۶) مصحف ابوالدرداءؓ (۷) مصحف معاذ بن جبل (۸) مصحف زید بن ثابت (۹) مصحف عبداللہ بن عمر (۱۰) مصحف ابوموسیٰ اشعری (۱۱) مصحف عمرو بن العاص (۱۲) مصحف سعد بن عبادہ (۱۳) مصحف سالم (۱۴) مصحف ابوایوب انصاری (۱۵) مصحف عبادہ بن الصامت (۱۶) مصحف تمیم الداری (۱۷) مصحف مجمع بن حارثہ (۱۸) مصحف عبداللہ بن عمرو بن العاص (۱۹) مصحف عتبہ بن عبداللہ بن الحارث (۲۰) مصحف لبید بن ربیعہ (۲۱) مصحف عقبہ بن عامر جہنی (۲۲) مصحف قیس بن ابی صعصعہ (۲۳) مصحف سکن بن قیس (۲۴) مصحف عمر فاروق (۲۵) مصحف عائشہ (۲۶) مصحف ام سلمہ (۲۷) مصحف حفصہ (۲۸) مصحف ام سلمہ (۲۹) مصحف ام ورقہ بنت نوفل۔

مصحف عثمانی: یہ مصحف حضرت عثمان غنی نے لکھا تھا۔ آخر میں مرقوم تھا۔ کتبہ عثمان ابن عفان۔ اسی مصحف میں آپ تلاوت فرما رہے تھے کہ حسب پیشین گوئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باغیوں نے آپ کے ہاتھ پر تلوار مار دی اور خون آیت فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم پر گرا (فتح العزیز) حضرت عثمان کے بعد یہ خلفائے بنی امیہ کے پاس رہا۔ نافع بن نعیم نے سنہ ۱۶۹ھ میں اس کی زیارت کی تھی (فتح العزیز) حافظ ابو عمر نے مقنع میں لکھا ہے کہ عبید بن قاسم بن سلام متوفی سنہ ۲۲۲ھ نے اس کو دیکھا تھا۔ شیخ ابن بطوطہ سیاح نے آٹھویں صدی ہجری میں بصرہ میں دیکھا تھا۔ امیر تیمور کے عہد میں (دسویں صدی ہجری) ابوبکر الشاشی نے حضرت عبداللہ کے مزار پر رکھ دیا تھا۔ جنگ عظیم (سنہ ۱۹۱۴ء) کے بعد جب روس میں بالشویک حکومت قائم ہوئی تو یہ نسخہ کہیں سے بالشویک کے ہاتھ لگ گیا۔ اب ماسکو میں موجود ہے۔

مصحف علی: ایک نسخہ مشہد میں اب تک موجود ہے۔ دوسرا نسخہ جامع ایا صوفیہ قسطنطنیہ کے کتب خانے میں تھا اس کو سلطان صلاح الدین نے خزانہ شاہی میں محفوظ کرا دیا تھا

تیسرا نسخہ جو حضرت علی نے عہد خلافت اول میں اپنی یاد سے مرتب کیا تھا۔ اس کو سنہ ۳۸۷ ہجری میں ابن الندیم نے ابی یعلیٰ حمزۃ الحسینی کے پاس دیکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ چند ورق تلف ہو چکے ہیں۔ (الفہرست)

چوتھا نسخہ مدینہ منورہ میں امانت مقدسہ میں تھا۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں امانات مقدسہ کے ساتھ مدینے سے قسطنطنیہ کو منتقل ہوا۔ وہاں اب تک موجود ہے۔ (کشاف البدائے)

پانچواں نسخہ جامع سیدنا حسین قاہرہ (مصر) میں ہے۔

مصحف عبداللہ بن مسعود: اصل نسخہ کی نقل دوسری صدی ہجری میں کی گئی تھی۔ اس نقل کو ابن الندیم نے دیکھا تھا۔ اس طرح اس اصل کا پتہ سنہ ۳۰ ہجری تک اور نقل کا سنہ ۳۷۷ ہجری تک چلتا ہے۔ یہ وہ نسخہ تھا جو انہوں نے کچھ آیات بترتیب نزول لکھی تھیں۔ پھر دوسرے نسخے میں طویل سورتیں لکھیں۔ یہ تیسرا نسخہ مکمل تھا۔ جو انھوں نے اپنے قبیلے کے

لغت پر لکھا تھا۔

عہد خلافت دوم۔ اس عہد میں حضرت عمرؓ نے زید بن ثابت سے اپنے واسطے قرآن لکھایا (معارف ابن قتیبہ)

حضرت ابوالدرداء کے پاس ایک جماعت آئی۔ ان کے پاس اپنے لکھے ہوئے قرآن تھے۔ ان کا یہ مقصد تھا کہ ان کو زید بن ثابت، ابی بن کعب اور علی مرتضیٰ کو دکھائیں۔ (کنز العمال۔ جلد اول)

حضرت عمرؓ نے ایک شخص کے پاس باریک خط میں لکھا ہوا قرآن دیکھا۔ آپ نے اس کو ہدایت کی کہ واضح الفاظ میں لکھے۔

علامہ ابن حزم نے لکھا ہے کہ عہد فاروقی میں مسلمانوں کے پاس قرآن کے لکھے ہوئے نسخے ایک لاکھ سے کم نہ تھے (کتاب الفصل)

مصر میں ایک شخص کے پاس اس عہد کا لکھا ہوا ایک جزو موجود ہے۔

عہد خلافت سوم۔ حضرت عثمان نے ۲۵ھ میں مصحف ام حضرت ام المومنین حفصہ کے پاس سے منگا کر لغت قریش کے موافق اس کی سات نقلیں کرائیں۔ ان میں سے ایک کو اپنے پاس رکھا۔ اسی وجہ سے اس کو **مصحف الامام** کہا گیا۔ اس کے آخر میں لکھا ہوا ہے ھذا ما اجمع علیہ جماعۃ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منھم زید بن ثابت وعبداللہ بن الزبیر وسعید بن العاص آگے اور صحابہ کے نام ہیں (نفح الطیب جلد اول) بتایا جاتا ہے حضرت عثمان حضرت عثمان کے پاس رہا۔ پھر حضرت علی کے پاس رہا۔ پھر امام حسن کے پاس رہا۔ اور خلافت کے ساتھ امیر معاویہ کے سپرد ہوا۔ پھر کسی طرح اندلس چلا گیا۔ وہاں سے مراکش کے دارالسلطنت فاس میں پہنچا۔ (تاریخ ادریسی و تذکرہ المصاحف) پھر کسی طرح مدینہ آگیا۔ جنگ عظیم میں ترکی گورنر فخری پاشا اس کو دوسرے متبرکات کے ساتھ قسطنطنیہ لے گیا۔ اور وہاں اب تک موجود ہے۔ باقی چھ نقلیں اس طرح تقسیم کی گئیں۔

(۱) ایک عبداللہ بن صائب کے ہاتھ مکہ معظمہ کو بھیجی گئی۔ اس کو مصحف مکی کہتے ہیں۔ یہ نسخہ ۶۵۷ھ تک قبہ تراب میں تھا۔ محمد بن جبیر اندلسی سیاح نے ۵۷۹ھ میں مکہ میں اس کو دیکھا تھا۔ ابوالقاسم احمد تجیبی متوفی ۶۶۳ھ نے بھی اس کی زیارت کی تھی۔ شیخ عبدالمالک نے ۸۳۰ھ ہجری میں اس کی زیارت کی تھی۔ مولوی شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ انہوں نے یہ نسخہ جامع دمشق میں دیکھا تھا۔ (تہذیب الاخلاق ماہ صفر ۱۳۲۹ھ) مولوی صاحب نے غالباً ۱۸۹۲ء میں سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں سیاحت کی تھی۔ مسجد میں آگ لگی تو یہ مصحف بھی جل گیا۔

(۲) ایک نسخہ مغیرہ بن شہاب کے ہاتھ شام کو بھیجا گیا۔ اس کو مصحف شامی کہتے ہیں۔ مورخ احمد مقری نے ۳۷۵ھ اس کی زیارت کی تھی۔ پھر یہ نسخہ کوفہ میں آگیا۔ وہاں سے سلاطین اندلس پھر سلاطین موحدین پھر امراء بنی مرین کے قبضہ میں آگیا اور جامع قرطبہ میں رہا۔ اہل قرطبہ نے اس کو سلطان عبدالمومن کے سپرد کر دیا۔ اس سلطان کے حکم سے ابن بشکوال نے ۱۱ر شوال ۵۵۲ھ کو قرطبہ سے دارالسلطنت مراکش کو منتقل کیا۔ ۶۴۶ھ میں خلیفہ معتضد علی بن مامون کے پاس تھا اس سال خلیفہ مذکور نے تلمسان پر فوج کشی کی، اور مارا گیا۔ اسی ہنگامہ میں یہ مصحف گم ہوگیا تھا۔ لیکن پھر کسی طرح تلمسان کے خزانے میں پہنچ گیا۔ وہاں سے ایک

تاجر اس کو خرید کر فاس لے آیا۔ جہاں یہ اب تک موجود ہے۔

(۳) ایک نسخہ عامر بن قیس کے ہاتھ بصرے کو بھیجا گیا تھا۔ اس کو مصحف بصری کہتے ہیں۔ اس کو کسی شخص سے سلطان صلاح کے وزیر نے ۵۰۵ھ میں بتیس ہزار اشرفی میں خریدا تھا (الخطط المقریزی) یہ مصحف کتب خانہ خدیو یہ مصر میں موجود ہے۔

(۴) ایک نسخہ ابو عبدالرحمن اسلمی کے ہاتھ کوفہ کو بھیجا گیا تھا۔ یہ مصحف کوفی مشہور ہے۔ اور قسطنطنیہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۵) ایک نسخہ یمن کو بھیجا گیا تھا۔ یہ کتب خانہ جامعہ ازہر مصر میں ہے۔ اس کو مصحف یمنی کہتے ہیں۔

(۶) ایک نسخہ بحرین کسی صحابی کے ہاتھ بھیجا گیا تھا جو اب کتب خانہ فرانس میں ہے۔

مصحف عثمانی دوم جامع سیدنا حسین قاہرہ (مصر) میں ہے۔ مصحف عثمانی سوم کتب خانہ جامعہ دہلی میں ہے۔ مصحف عثمانی چہارم پر یہ لکھا ہے کہ کتبہ عثمان ابن عفان۔ یہ نسخہ شاہان مغلیہ کے پاس تھا۔ اس پر اکبر کی مہر لگی ہوئی ہے۔ ۱۸۲۵ء میں یہ نسخہ میجر لارنس کو ملا۔ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کتب خانہ کو دیدیا۔ لندن میں اب تک موجود ہے۔ اس کے ۸۱ صفحات ہیں۔ فی صفحہ ۱۶ سطر ہیں۔ سورتوں کے نام ٹیڑھے خط میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور دس آیتوں کے بعد ایک نشان ایسے حرف کی صورت میں ہے جو ایک قدیم مغربی زبان کے حرف کی طرح ہے۔ دو سو آیتوں کے بعد حاشیہ پر ایک نشان ہے۔

غرض کہ حضرت عثمان کا لکھا ہوا ایک نسخہ تو روسیوں کے قبضہ میں ہے جس کا ذکر آچکا ہے۔ اور ان کے عہد کا ایک نسخہ (بحرین) فرانس کے کتب خانہ میں ہے اور ان کا لکھا ہوا ایک نسخہ لندن میں ہے ؎

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

مصحف ابن مسعودؓ: حضرت عبداللہ بن مسعود صحابی نے حضرت عثمان کے عہد میں جو نسخہ لکھا تھا۔ وہ کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ میں ہے۔ مہتمم کتب خانہ مذکور شیخ ابراہیم حمدی ۱۳۵۷ہجری میں اس کو ہندوستان میں لائے تھے۔

مصاحف عہد خلافت چہارم: حضرت علیؓ نے بھی قرآن لکھے۔ حیات رسول میں بھی اور بعد وفات رسول بھی۔ حضرت کا لکھا ہوا ایک نسخہ کتب خانہ جامعہ ملیہ دہلی میں ہے۔ حضرت کے رقم فرمودہ چند اوراق قرآن مجید شاہی مسجد لاہور میں ہیں۔ آپ کی لکھی ہوئی چند سورتیں امیر تیمور کے ہاتھ آگئی تھیں جو کسی زمانہ میں لاہور کے کتب خانہ میں رہیں۔ پھر برلن کے کتب خانہ میں پہنچ گئیں۔ اب انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں ہیں۔ اس کے علاوہ اور چند سورتیں حضرت کی لکھی ہوئی اسی کتب خانہ میں ہیں۔ ایک نسخہ حضرت کا مرقومہ تبرکاً سنت جامع مسجد دہلی میں ہے۔ یہ نسخہ فتح دمشق میں امیر تیمور کے ہاتھ لگا تھا۔ حبیب الرحمن خاں شروانی کے کتب خانہ میں بھی حضرت کے مرقومہ چار ورق ہیں۔ حضرت علی کے خادم خالد بن ہیاج مشہور خوشنویس تھے۔ ان کا لکھا ہوا ایک

نسخہ علامہ ابن ندیم نے محمد بن حسین بغدادی کے کتب خانہ میں چوتھی صدی ہجری میں دیکھا تھا۔

مصحف حسنی حضرت امام حسنؑ کا مرقومہ ایک نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں ہے۔ اور ایک جامع مسجد دہلی کے تبرکات میں ہے۔ اور ایک کابل میں ہے۔ اس کے ایک ورق کا فوٹو سنہ ۱۳۱۱ھ میں مجلہ کابل میں شائع ہوا تھا۔

مصحف حسینی حضرت امام حسینؑ کا لکھا ہوا نسخہ تبرکات جامع مسجد دہلی میں ہے اس عہد تک اس قدر قرآن لکھے گئے کہ ان کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ جنگ صفین میں جب امیر معاویہ کی فوج نے نیزوں پر قرآن بلند کئے تو یہ تعداد میں پانسو تھے جب میدانِ جنگ میں یہ کثرت تھی تو گھروں اور شہروں کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔

خلافت راشدہ کے بعد امام زین العابدینؑ ابن امام حسین المتوفی سنہ ۹۴ھ کا مرقومہ نسخہ کتب خانہ جامعہ ملیہ دہلی میں ہے اسی عہد کا ایک نسخہ کتب خانہ دار العلوم دیوبند میں ہے

طاؤس بن کیسان تابعی متوفی سنہ ۱۰۶ھ نے ایک قوم کو دیکھا جو قرآن لکھ کر فروخت کرنے کا پیشہ کرتی تھی (طبقات قسم دوم جلد دوم)

قرنِ دوم۔ اس زمانے کے مصاحف دنیا کے مختلف مقامات میں موجود ہیں۔ جن کے متعلق میری معلومات بہت کم ہیں ہندوستان ہی میں جو قدیم نسخے ہیں انھیں کی پوری نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔ پھر دیگر ممالک کا کیا ذکر۔ امام جعفر صادق المتوفی سنہ ۱۴۸ھ کا لکھا ہوا نسخہ جامع مسجد دہلی کے تبرکات میں ہے۔ سنہ ۱۶۵ھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ قاہرہ (مصر) میں ہے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)

قرنِ سوم:۔ امام علی رضا ابن امام موسیٰ کاظم المتوفی سنہ ۲۰۳ھ کا مرقومہ نسخہ بڑودہ کے کتب خانہ میں ہے (تاریخ مصحف سماوی)، یہ نسخہ ایران میں تھا۔ کسی طرح سلاطینِ گجرات کے پاس آگیا۔ احمد آباد میں خزانہ شاہی میں محفوظ رہا۔ جب مرہٹوں نے احمد آباد کو لوٹا تو یہ نسخہ بھی لوٹ میں آیا۔ اسحاق بن مرار شیبانی المتوفی سنہ ۲۶۰ھ نے جامع مسجد کوفہ کے منبر پر ایک نسخہ لکھ کر رکھ دیا تھا۔ ان سے اس قدر فرمائشیں ہوئیں کہ بہت سے نسخے لکھنے پڑے۔ ان کے لکھے ہوئے نسخے بغداد اور کوفے میں موجود ہیں

دنیا میں صرف قرآن ہی ایسی کتاب ہے جو صاحب کتاب تک اپنی صحیح سند پہنچاتی ہے۔ اور جس کو تعلیم و تحریر دونوں کے اعتبار سے تواتر حاصل ہے۔ اس کے مرقومہ نسخے عہدِ رسالتؐ کے ربع اوّل سے آج تک کے مسلسل زمانوں کے مختلف کاتبوں کے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ جن میں کہیں ایک حرف کا فرق نہیں ہے۔ خداوند ذوالجلال نے خود فرمایا تھا کہ اس کتاب کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے۔ جس کی تصدیق چودہ صدیوں سے آج تک ہو رہی ہے۔ یہ ایک محیر العقول معجزہ ہے اور مخالفینِ اسلام تک نے اس کو تسلیم کیا ہے۔

اعجاز القرآن (از علامہ تمنا عمادی مدظلہٗ) جس میں مختلف جہات سے قرآن کے اعجاز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
سائز ۸/۳۰ x ۲۰، ۱۱۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

سب کی پسند
مسواک
ٹوتھ برش
ٹوتھ پیسٹ
MISWAK
Tooth Paste
MAKES
TEETH
PEARLY
WHITE

حقائق و عبر

۱- یؤثرون علیٰ انفسھم آپ کو وہ واقعہ تو یاد ہوگا کہ جب لاہور کی شاہی مسجد سے ہجوم مومنین عید کی نماز پڑھ کر باہر نکلا ہے تو اس ریلے میں قریب چھبیس آدمی، بین مسجد کے بڑے دروازے کے بیچ پاؤں تلے روندے گئے تھے۔ وہ نسبتاً کمزور تھے۔ ہجوم کے دھکوں سے نیچے گر گئے اور پیچھے سے آنے والے انہیں روندتے اور کچلتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔

اور اگر آپ کو یہ واقعہ بھول گیا ہو تو آپ کسی شام، کسی بس اسٹینڈ پر جا کر کھڑے ہو جائیے اور پھر دیکھئے کہ بس کے رکتے ہی چڑھنے والوں اور اترنے والوں کی کشمکش کا کیا عالم ہوتا ہے اور اس دھکم دھکا میں کتنے کمزور اور نحیف۔ کتنے بوڑھے اور بیمار۔ کتنی عورتیں اور بچے کچلے جاتے ہیں۔ یہی حالت ریلوے اسٹیشن کی کھڑکی پر ٹکٹ لینے والوں کی ہوتی ہے۔ اور یہی کیفیت سینما ہال میں گھسنے والوں کی۔ ریلوے اسٹیشن ہو یا بس کا اڈہ، سینما ہال ہو یا صحن مسجد۔ زندگی کے ہر گوشے میں ہماری نفسا نفسی اور افراتفری کا یہی عالم ہے۔ ہر شخص دوسرے کو دھکا دے کر آپ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارا کیریکٹر یہی ہے۔ یہی ہمارا قومی امتیاز ہے۔ یہ ان کا امتیازی نشان ہے جن کے متعلق کبھی کہا گیا تھا کہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹) وہ خود تنگی اور مصیبت میں بھی کیوں نہ ہوں، ہمیشہ دوسروں کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں۔

اب دوسری طرف آیئے۔ آپ نے اولمپک کے کھیلوں کا نام سنا ہوگا۔ اس میں دنیا کی متعدد قوموں کے منتخب کھلاڑی حصہ لیتے ہیں اور ان کا مختلف کھیلوں میں باہمی مقابلہ ہوتا ہے۔ جیتنے والا ساری دنیا میں نمبر اوّل کا کھلاڑی تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ اتنا بڑا اعزاز ہے جس کے لئے کھلاڑی سال بھر اپنا لہو پسینہ ایک کر دیتے ہیں۔ انہی کھیلوں میں دوڑ کا بھی مقابلہ ہوتا ہے۔ ایک میل کی دوڑ قریب چار منٹ میں ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی کھلاڑی پندرہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہے ہوتے ہیں۔ اس میں ایک ایک قدم فیصلہ کن ہوتا ہے۔ اگر کوئی مقابلہ کرنے والا ایک قدم بھی پیچھے رہ جائے تو وہ ہار جاتا ہے۔ اس کی ساری شہرت خاک میں مل جاتی ہے۔ آپ ذرا غور کیجئے کہ مقابلہ کرنے والوں کے لئے یہ چار منٹ کس قدر گہری کشمکش کے ہوتے ہیں۔ مشرقی شاعر تو صرف اسی قدر کہہ سکا تھا کہ

رستم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر

لیکن اس مقابلہ میں پاؤں سے کانٹا نکالنا تو ایک طرف کانٹے کی چبھن سے رفتار میں خفیف سی سستی بھی محمل کو دسترس سے باہر

کر دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔

ذرا نگاہ میں لائیے اس منظر کو کہ ملبورن کے اولمپک کے میدان میں دوڑ کا مقابلہ ہے۔ کھلاڑیوں کی کشمکش اپنی انتہائی شدت تک پہنچ چکی ہے۔ مسافت صرف ۵۰ گز کی باقی رہ گئی ہے یعنی اتنی تھوڑی کہ اب اگر کسی کا ایک قدم بھی پیچھے پڑ گیا تو اس کی فتح کا شکست میں بدل جانا یقینی ہے۔ لینڈی (Landy) تیسرے نمبر پر جا رہا ہے۔ یعنی دو کھلاڑی اس سے آگے ہیں۔ اس کی نگاہ نشانِ منزل پر ہے اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس نشان کی طرف تیر کی طرح اڑے جا رہا ہے۔ کلارک اس سے آگے دوسرے نمبر پر ہے۔ اتفاق سے کلارک دوڑتے دوڑتے گر پڑتا ہے۔

یہ اتفاقی حادثہ لینڈی کے لئے کس قدر خوشی کا موجب ہوگا! وہ ایک جست میں آگے نکل گیا ہوگا۔ ہم یہی سوچ سکتے ہیں لیکن نہیں۔ وہاں ایسا نہیں ہوا۔

لینڈی نے جب اپنے حریف کو گرتے دیکھا تو ایک سیکنڈ میں رکا کلارک کو اٹھایا۔ اور جب دیکھا کہ اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تو پھر دوڑنا شروع کر دیا۔

اور آپ یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ اس نے بازی بھی جیت لی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے رُک کر دوبارہ دوڑنے میں جو تازہ توانائی آئی اس میں قلب کے اس سکون کا کتنا حصہ ہوگا جو اسے اپنے گرے ہوئے ساتھی کو اٹھانے سے حاصل ہوا تھا۔ بہرحال اس بات کو الگ رکھئے۔ دیکھئے صرف یہ کہ شاہی مسجد لاہور کا واقعہ ہمارے ہاں کے نمازیوں کا تھا۔ اور یہ واقعہ اُن کے ہاں کے کھلاڑیوں کا ہے۔

یہ ہیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

جب تک ہم اس حقیقت کو نہیں سمجھ لیتے کہ انسانیت کا معیار یہ ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کس قسم کا ہے۔ اس وقت تک ہم یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ نیکی کسے کہتے ہیں اور دین کی غرض و غایت کیا ہے۔ قرآن یہی سکھانے کے لئے آیا تھا۔

۲۔ اس لغویت کی کوئی حد بھی ہے؟

دورِ حاضر میں قوموں کی ترقی کے لئے ریڈیو ایک بڑا مؤثر ذریعہ ہے اس سے آہستہ آہستہ اُبھرنے والی نسلوں کے قلب و دماغ کی تربیت ہوتی جاتی ہے اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک جہانِ نو وجود میں آجاتا ہے۔ اس سے نیچے اتریئے تو یہ تفریح کا بھی نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔ اس سے محنت سے تھکے ہوئے احباب خوشگوار سکون حاصل کرتے ہیں جس سے ان کی صرف شدہ توانائی پھر سے واپس آجاتی ہے۔ یہ بھی درحقیقت تعمیری کا ایک گوشہ ہے۔ زندہ قومیں اس ذریعۂ تعمیر و تربیت سے بڑے کام لے رہی ہیں۔ لیکن اس قسم کا مفید اور مؤثر ذریعہ جب ہماری قوم کے ہاتھ آجائے تو اس کا کیا حشر ہوتا ہے اس کا اندازہ ریڈیو پاکستان کی نشریات سے لگ سکتا ہے۔ اس میں حالت یہ ہے

کہ تربیتی اور تعمیری عناصر کو تو چھوڑئیے، خالص تفریحی پروگراموں کا بھی یہ عالم ہے کہ ان سے زیادہ بھیانک چیزیں شاید ہی کہیں اور سنائی دیتی ہوں۔ اور یہ بدمزاقی دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہے۔

لیکن اس سے کہیں زیادہ جگر سوز اور دل خراش وہ پروگرام ہیں جو ہماری ملی تقاریب پر نشر ہوتے ہیں۔ ان تقاریب میں عید میلاد النبیؐ کا جو مقام ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تقریب صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کے لئے حسین تمناؤں اور تابندہ آرزوؤں کا پیام حیات اپنے ساتھ لاتی ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے مرکزی ریڈیو سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اس تقریب پر وہاں سے ایسے پروگرام نشر ہوں جو مقام محمدیؐ اور پیام خداوندی کی عظمتوں کو دنیا کے سامنے آشکارا کردیں اور جو موجودہ معاشرہ کی ستائی ہوئی انسانیت کے لئے امیدوں کا سہارا بنیں۔ لیکن اس سال ریڈیو پاکستان کی طرف سے جس انداز سے اس تقریب کو منایا گیا اس کے تصور سے ہماری آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ جب گھنڈی گھمائیے یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک صف ماتم بچھ رہی ہے جس سے آہ و بکا اور شیون و شین کی دردانگیز صدائیں مسلسل چلی آرہی ہیں۔ کبھی اقبالؔ کو ٹھنڈی آہیں بھر کر گایا جارہا ہے اور اس کے پیچھے دور سے اللہ ہو۔ اللہ کے لاہوتی کورس سے عجیب دہشت انگیز منظر پیدا کیا جارہا ہے کبھی مسدس حالی کی سوز خوانی شروع ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ بھی عجیب و غریب وحشتناک آوازیں ملائی جاتی ہیں جن سے اندھیری رات میں قبرستان کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ آخر میں ـــ اے خاصۂ خاصانِ رسلؐ وقت دعا ہے۔ کو ہچکیاں لے لیکر پڑھا جاتا ہے اور اس کے پیچھے بھرائی ہوئی آواز میں صلے اللہ علیک یا رسول اللہ وسلم علیک یا حبیب اللہ۔ اس انداز سے دہرایا جارہا ہے گویا ایک ماتمی جلوس ہے جو آہستہ آہستہ کلمۂ شہادت پڑھتا جنازہ لئے جارہا ہے۔

ہم ارباب حل و عقد سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ان پروگراموں کو کون ترتیب دیتا ہے اور کون ان کی تصویب کرتا ہے؛ کیا ان میں سے کوئی بھی اتنا نہیں سوچتا کہ ان تقریبوں کا تقاضا کیا ہے اور ریڈیو کا اس باب میں فریضہ کیا؟ کیا کسی کو بھی اس کا خیال نہیں آتا کہ ان پروگراموں کا اپنی قوم پر کیا اثر پڑتا ہے اور انہیں سن کر دنیا ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرتی ہے؟ ہمارے متعلق ہی نہیں بلکہ خود اس دین کے متعلق جس سے ہم اپنے آپ کو متمسک بتلاتے ہیں اور اس ذات اقدس و اعظمؐ (روحنا فداہ) کے متعلق جس کے برگزیدہ نام سے ہم یہ تقریبات مناتے ہیں؛ بالآخر کوئی مقام تو ایسا ہونا چاہیئے جسے ان لغویتوں سے بلند رکھا جائے! اور اگر ہم ایسا نہیں کرسکتے تو اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ ان تقریبات کو ریڈیو پر منایا ہی نہ جائے۔

تا نداری از محمدؐ رنگ و بو

از درود خود میالا نام او

کیا مرکزی حکومت کا محکمۂ اطلاعات و نشریات اس طرف توجہ دے گا؟

بابُ المراسلات

چند اہم سوالات

مشرقی پاکستان سے ایک عزیز بن اپنے خط میں لکھتی ہیں۔

اکتوبر کے طلوع اسلام میں آپ کا بصیرت افروز مقالہ "تکذیب دین کون کرتا ہے" اور مصلی کسے کہتے ہیں: پڑھا آپ نے قرآنی تعلیم کے ان دو اہم گوشوں کی جیسی وضاحت کی ہے اس کی تعریف میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ہر بات تیر کی طرح سینے میں ترازو ہو گئی۔ اس ضمن میں البتہ میرے دل میں ایک سوال پیدا ہوا ہے جس کا جواب آپ ہی دے سکتے ہیں۔ تکذیب دین کرنے والوں کی وضاحت کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جہنم اُسے آوازیں دے دے کر بلاتی ہے جو سیدھے راستے سے مُنہ پھیر کر چل دیتا ہے یا اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے اور یہ وہ ہے جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر تھیلی کا مُنہ کس کر باندھ دیتا ہے کہ یہ مال کسی اور کے کام نہ آسکے۔ (پھر یہ کہ) جو مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا رہتا ہے کہ کتنا ہو گیا اور اس میں کتنا اور بڑھا لیا جائے۔" تو کیا ان آیات کا یہ مطلب نہیں کہ انفرادی طور پر اپنی ضرورتوں کے پورا ہونے کے بعد فالتو روپیہ اپنے پاس جمع کر کے رکھنا جائز نہیں۔ اور اگر قرآنی آیات کا یہی مفہوم ہے تو پھر جو لوگ فرداً فرداً روپیہ پیسہ بچا کر اور جمع کر کے رکھتے ہیں وہ کہاں تک حق بجانب ہو سکتے ہیں اور مستقبل کی فکر میں محض خیالی مصیبتوں یا ضرورتوں کے پیش نظر پس انداز کرنے کی کیا وجہ جواز ہو سکتی ہے؟ اس کے علاوہ آپ نے اپنی ہر تحریر میں اس کی بیّن طور پر وضاحت کی ہے کہ نظامِ خداوندی میں انفرادی و ذاتی ملکیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر ہم مسلمانوں کا یہ فعل کہ اپنی ضرورتوں سے فاضل روپیہ بچا کر اپنے پاس یا بینکوں کی تجوریوں میں رکھنا قرآنی تعلیم اور منشائے خداوندی کے بالکل خلاف ٹھہرا۔ تو کیا قرآنی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کے لئے ہم فرداً فرداً ان لعنتوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے کا حق نہیں رکھتے؟ کیونکہ آپ نے طلوع اسلام کے اسی پرچے میں "اطاعت رسول" کے مقالہ میں واضح کیا ہے کہ "جب تک خلافت کا یہ سلسلہ قائم نہیں ہو جاتا کسی فرد کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اُمّت کے امور شریعت (نماز۔ روزہ حج۔ زکوٰۃ وغیرہ کی جزئیات) جس طریق پر چلی آ رہی ہیں اس میں کوئی تغیر و تبدل کرے وہ صرف اتنا کر سکتا ہے کہ یہ بتا دے کہ فلاں معاملہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ قرآن کے مطابق نہیں" تو کیا جب تک خلافت علیٰ منہاج نبوت کا سلسلہ دوبارہ قائم نہیں ہو جاتا ہم میں سے دین کی حقیقت سمجھ لینے والے مسلمان بھی بدستور سابق غلط راستے پر چلتے رہیں اور گناہوں کے

جہنم میں غرق ہوتے چلے جائیں! پھر آخر اذہان و قلوب کی اصلاح ہو جانے کے بعد بھی یہ خارجی انقلاب یعنی نظام خداوندی کا قیام کس طرح عمل میں آسکتا ہے جبکہ عملی صورت میں اس کے لئے سعی نہ کی جائے گی۔ برادر نوازش میری اس الجھن کو دور کیجئے میں یہ جانتی ہوں کہ اسلام جماعت کا نام ہے اور ہم سب ایک ہی لڑی کے موتی بن کر" دین دار" ہو سکتے ہیں تاہم ایک ایک کو باہم متحد کرنے سے ہی جماعت ظہور میں آسکتی ہے۔ پھر ہمیں وہ نور کیسے حاصل ہوگا جس سے زمین جگمگا اٹھے گی اور جس کی روشنی میں" انسانیت اپنے بلند مقامات کی طرف رواں دواں چل پڑے گی"۔ قربانی کے متعلق آپ نے مدتوں کے غلط زاویۂ نگاہ کو قرآن کی روشنی میں بدلا اور قربانی کی حقیقت بتائی۔ جب دل پر یہ صداقت نقش ہو گئی اور قربانی کے متعلق قرآنی احکام کو جان لیا تو اس کے بعد میں نے اس بارے میں عمل میں ترمیم کی اور عید الفطر کے موقع پر قربانی کے بکرے دینے چھوڑ دیئے۔ مگر آپ یہ کہتے ہیں کہ انفرادی طور پر کسی ترمیم کا حق نہیں پہنچتا تو کیا میں یہ جان کر بھی کہ قریہ قریہ اور شہر شہر قربانی کے بکروں کو کاٹنا صریحاً غلط ہے اسی طریقہ پر کاربند رہوں؟ شب برات کی اصلیت کی آپ نے وضاحت کی چنانچہ اس کے متعلق برسوں سے دل پر غلط معتقدات جمے ہوئے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ کیا میرا یہ فرض نہیں کہ میں اس خواہ مخواہ کے ثواب سے خود باز رہوں اور دوسروں کو باز رکھوں؟ ابھی ایک اور سوال کا جواب لینا ہے وہ یہ کہ آپ اطاعت رسول کے مقالے میں جزئیات کی تبدیلی کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کے زمانے سے لے کر عہد صدیقی تک ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک شمار کر کے طلاق رجعی قرار دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے تین شمار کر کے طلاق مغلظ قرار دے دیا۔ چنانچہ فقہ کی رُو سے امت کا عمل اس کے مطابق ہو رہا ہے۔ اور ساتھ ہی آپ نے لکھا ہے کہ (ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ قرآن کی رُو سے صحیح طلاق کی پوزیشن کیا ہے) آپ قرآن کی رُو سے صحیح طلاق کی پوزیشن کو بہت اچھی طرح تحریر فرما چکے ہیں اور آپ لکھتے رہے ہیں کہ قرآن نے بعض مسائل کی جزئیات تک طے کر دی ہیں ان میں سے ایک طلاق ہے اور یہ بھی کہ قرآن کی متعین کردہ جزئیات کو نہیں بدلا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ پھر طلاق کے بارے میں قرآن کی بتائی ہوئی تمام باتوں میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ آپ یہ بھی حقیقت بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے فقہ کی متعین کردہ شرائط طلاق قرآن کی بتائی ہوئی طلاق کے مطابق نہیں۔ مگر اب آپ نے لکھا ہے کہ فقہ کی رُو سے طلاق کے بارے میں اُمت کا عمل اسی کے مطابق ہو رہا ہے جسے کہ حضرت عمر نے اپنے زمانے میں قرار دیا تھا۔ گویا (معاذ اللہ) حضرت عمر قرآن کے بتائے ہوئے احکام میں تغیر و تبدل کرنے کے مجاز تھے۔ اگر تھے تو پھر ہم حضرت عمر کے بتائے ہوئے طریقے کی متعین کردہ شرائط طلاق کو کیونکر غلط کہہ سکتے ہیں۔ آخر یہ بات کیا بنی؟ — میری سمجھ کا یہ قصور آپ کی مہربانی سے ہی دور ہوگا۔

طلوع اسلام سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا ہم انفرادی طور پر روپیہ پیسہ جمع کرنا چھوڑ دیں؟ جواباً عرض ہے کہ جب اسلامی معاشرہ (نظام ربوبیت) دولت کے اکتناز (اور ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت) سے منع کرتا ہے تو

اس کے ساتھ ہی وہ اس کی بھی ضمانت دیتا ہے کہ افراد معاشرہ کی تمام ضروریات زندگی کی بہم رسانی کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ لیکن ہمارے موجودہ معاشرہ کی حالت یہ ہے کہ اگر کسی ایک فرد پر کوئی وقت آپڑے تو اسے کوئی دوسرا پوچھتا تک نہیں۔ اس لئے اس معاشرہ میں ہر ایک کو اپنی اور اپنے بال بچوں کی فکر آپ کرنی پڑتی ہے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ انسان کے پاس کچھ پس انداز ختہ ہو جو ایسے وقت میں کام آسکے۔ لہٰذا موجودہ حالات میں کچھ جمع کرنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم اس قرآنی معاشرہ کی طرف قدم کیسے بڑھائیں سو اس کی صورت یہ ہے کہ اگر مختلف حلقوں میں ایسے لوگ ہوں جو اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل ضروری سمجھتے ہوں تو انہیں باہمی تعاون سے ایک چھوٹا سا یونٹ بنالینا چاہیئے جس میں ایک فرد دوسرے فرد کا سہارا بن جائے۔ اس طرح چھوٹے چھوٹے پیمانے پر تجربہ کے بعد اس حلقے کو وسیع کرتے چلے جانا چاہیئے۔ بحالات موجودہ ہم انفرادی طور پر یہی صورت اختیار کر سکتے ہیں لیکن اس میں بڑے حزم و احتیاط اور غور و فکر کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے کہ اگر اس قسم کا تجربہ ہماری بے احتیاطی کوتاہی یا عدم تدبر کی وجہ سے ناکام رہ گیا تو اس کے اثرات بڑے دور رس ہوں گے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ایک طرف ہم کہتے ہیں کہ دین کی جزئیات جس طریق پر رائج چلی آرہی ہیں ان میں تغیر و تبدل کرنے کا حق کسی فرد کو نہیں پہنچتا اور دوسری طرف ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ جو باتیں قرآن کے خلاف ہیں ان میں اصلاح کرنا ضروری ہے۔ سو ان دونوں مسالک میں تطبیق کی کیا شکل ہوگی؟ جواباً گذارش ہے کہ جو کچھ ہمارے معاشرہ میں ہو رہا ہے ان میں بعض امور ایسے ہیں جن کی اصلاح انفرادی طور پر ہو سکتی ہے اور بعض ایسے جن کی حیثیت اجتماعی ہے۔ جو امور انفرادی ہیں ان میں ہم اپنے طور پر اصلاح کر سکتے ہیں اور دوسروں کو اصلاح کی تلقین بھی کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے شب برات کی مثال میں کہا ہے۔ اس قسم کی تقاریب میں جو باتیں خلاف قرآن ہوتی ہیں انہیں ہم انفرادی طور پر ترک کر سکتے ہیں اور دوسروں کو علم و برہان کی رو سے اصلاح کی تلقین کر سکتے ہیں۔

لیکن جو امور اجتماعی حیثیت رکھتے ہیں ان میں ہم انفرادی طور پر ردوبدل نہیں کر سکتے۔ مثلاً اس وقت ہمارے ہاں مختلف فرقوں میں نماز پڑھنے کے مختلف طریقے رائج ہیں (یہ اختلاف چھوٹی چھوٹی باتوں ہی میں کیوں نہ ہو بہرحال، اختلاف تو ہے) یہ ظاہر ہے کہ جب ایک امت کا ایک دین ہو تو اس کے اجتماعی امور میں چھوٹے چھوٹے اختلاف بھی نہیں ہو سکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان اختلافات کو مٹا کر نماز کی واحد شکل قائم کرنے کی کیا صورت ہو؟ سو یہ چیز انفرادی طور پر ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے غور و فکر کے بعد سوچ لیا ہے کہ اس کی صحیح شکل کیا ہے تو اسے اس کا قطعاً حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے سوچے ہوئے طریقہ کو امت میں رائج کرنے کی کوشش کرے۔ اس سے امت میں مزید انتشار پیدا ہو جائے گا۔ اسے اس کا حق اس لئے نہیں پہنچتا کہ دین کی جزئیات صرف اسلامی نظام متعین کر سکتا ہے اور اسی کو ان میں اپنی ضروریات کے ماتحت تغیر و تبدل کا حق حاصل ہے۔ سو جب تک ایسا نظام قائم نہیں ہو جاتا ان جزئیات کو علی حالہ رہنے دینا چاہیئے۔ ہمیں نہ خود اپنے طور پر ان میں کوئی تبدیلی پیدا کر کے نیا فرقہ کھڑا کرنا چاہیئے اور نہ ہی دوسروں کو ایسی تبدیلی کی تلقین کر کے ملت میں فتنہ برپا کرنا۔ ہمیں اصولاً اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت

اور اہمیت کی تلقین کرتے رہنا چاہیئے۔

کسی غیر قرآنی تصور یا رسم کو چھوڑ دینا اور بات ہے اور قرآنی اصولوں کی روشنی میں متعین شدہ جزئیات میں تبدیلی پیدا کرنا اور چیز۔ ان دونوں کے فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

تیسرا سوال طریقۂ طلاق کے متعلق ہے۔ سو اس باب میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے ہاں کے قدامت پسند طبقہ کا کہنا یہ ہے کہ کسی معاملہ میں جو طریق رسول اللہؐ نے اختیار فرمایا تھا اس میں ردوبدل کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔ اس کے برعکس ہمارا کہنا یہ ہے کہ رسول اللہ نے جو فیصلے اپنے زمانے میں صادر فرمائے تھے اگر حضورؐ کے بعد خلفائے راشدین دیکھیں کہ ان کے زمانے میں حالات بدل چکے ہیں تو وہ اصل اصولِ قرآن کو قائم رکھتے ہوئے ان فیصلوں میں تبدیلی کر سکتے ہیں۔ قدامت پسند حضرات اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ آپ مانتے ہیں کہ

(۱) رسول اللہ نے طلاق کا ایک طریقہ اختیار فرمایا۔

(۲) حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف دوسرا طریق اختیار فرمایا۔ اور یہی طریقہ امت میں رائج چلا آرہا ہے اور فقہ کا اس پر اصرار ہے۔

تو اس سے واضح ہے کہ آپ خود اس کے قائل ہیں کہ نبی اکرمؐ کا ایک صحیح جانشین (خلیفہ) حضورؐ کے کسی فیصلہ میں تبدیلی کر سکتا تھا۔ یعنی ہم نے اپنے دعوے کی تائید میں خود انہی حضرات کی ایک تسلیم شدہ بات کو پیش کر دیا۔ اسے استدلالی اصطلاح میں الزامی حجت کہتے ہیں۔ یعنی جو بات فریق مقابل کو پہلے سے تسلیم ہو اسے اس کے خلاف بطور دلیل پیش کر دینا۔

اب رہا یہ کہ طلاق کا جو طریقہ رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یا جس کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف کی جاتی ہے وہ قرآن کی رُو سے کیسا ہے سو جیسا کہ ہم متعدد بار بہ صراحت لکھ چکے ہیں، قرآن کا بتایا ہوا طریقہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ اس لئے ہمارا کہنا یہ ہے کہ ان طریقوں کو رسول اللہ یا حضرت عمرؓ کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ نہ رسول اللہ کوئی طریقہ قرآن کے خلاف اختیار فرما سکتے تھے اور نہ ہی حضرت عمرؓ قرآن کے طریقہ میں تبدیلی کر سکتے تھے۔ یعنی دین کے جس معاملہ میں قرآن کریم نے خود جزئیات متعین نہیں کیں رسول اللہؐ کو اس کا اختیار تھا کہ آپ ان جزئیات کو متعین فرماتے اور حضور کے خلفاء کو اس کا حق حاصل تھا کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضے کے مطابق ان جزئیات میں تبدیلی کر لیتے۔ لیکن قرآن کی متعین کردہ جزئیات میں کسی قسم کے ردوبدل کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ مثلاً قرآن نے کہا ہے کہ وضو میں کہنیوں تک ہاتھ دھونے چاہئیں (فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ) تو اب کسی کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہنی سے ایک، انچ نیچے تک ہاتھ دھونے کو صحیح قرار دیدے۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ رسول اللہؐ یا حضورؐ کے خلفاء نے کسی ایسے معاملہ میں ایسا کیا تھا تو ہم کہہ دیں گے کہ تاریخ کا یہ بیان غلط ہے۔ حضورؐ اور آپ کے سچے جانشین کبھی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔

امید ہے ان تصریحات سے امور مستفسرہ واضح ہو گئے ہوں گے

۲۔ نکاح کے وقت

ڈاہوسے طلوع اسلام کے ایک بزرگ کرم فرما تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارے ملک میں عام طور پر نکاح کے موقعہ پر لڑکی کی طرف سے دو وکلاء کے ذریعہ ایجاب وقبول کرایا جاتا ہے۔ حالانکہ خود لڑکی اسی مکان کے دوسرے کمرہ میں موجود ہوتی ہے۔ نکاح کا دوسرا نام اقرار نامہ یا عہد نامہ ہے۔ دنیا کے تمام معاملات میں معاہدے کے وقت گواہوں کے روبرو فریقین کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے بجز اس کے کہ کسی خاص وجہ سے کوئی ایک فریق خود حاضر نہ ہو سکے اور یہ کام (By proxy) طے پا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ نکاح کے معاہدہ میں فریقین خود کیوں نہ شامل ہوں۔ براہ کرم مطلع فرمائیں کہ قرآنی تعلیم کے مطابق نکاح کا صحیح طریقہ کیا ہے۔

طلوع اسلام

قرآن کریم نے نکاح کا کوئی طریقہ تجویز نہیں کیا۔ حتیٰ کہ نکاح خواں کی ضرورت بھی نہیں بتائی۔ نکاح ایک معاشرتی رسم ہے۔ اس میں قرآنی حصہ اتنا ہی ہے کہ عاقل اور بالغ مرد اور عورت ان تمام حقوق وفرائض کو قبول کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے اس باب میں عائد کئے ہیں ازدواجی زندگی بسر کرنے کا باہمی معاہدہ کریں۔ اس میں گواہوں کی ضرورت کسی بعد میں پیدا ہونے والی پیچیدگی کے لئے احتیاطی تدبیر ہے۔ ہمارا موجودہ طریقہ نکاح ہمارے اس غیر قرآنی تصور کی یادگار ہے کہ نکاح کے معاملہ میں لڑکی کچھ دخل نہیں دے سکتی۔ یہ فیصلہ اس کے ولی کا ہے اور اسے ولی بشمولیت وکیل طے کرتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ نکاح کے موقعہ پر لڑکی میں ایک خاص جھجک ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ (اسلامی پردہ ہی میں سہی) عام مجمع میں اس قسم کی موجودگی میں تامل کرے گی۔ لیکن اس کے لئے اس کا عام مجمع میں آنا کیا ضروری ہے۔ اپنے چند قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں لڑکے اور لڑکی کو ایک دوسرے کے بالمواجہ اس عہدنامہ کا اقرار کر لینا چاہیئے۔ اس کے لئے نہ کسی حاجب ودربان کی ضرورت ہے نہ ولی اور وکیل کی۔

قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کیلئے

طلوع اسلام کے اہم مضامین کو پمفلٹوں کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے اور ان کی قیمت برائے نام رکھی جاتی ہے تاکہ ان کی اشاعت زیادہ سے زیادہ ہو سکے اس سلسلہ میں اب تک حسب ذیل پمفلٹ شائع کئے جا چکے ہیں

روٹی کا مسئلہ ۲ر علماء کون ہیں؟ ۱ر تکذیب دین کون کرتا ہے؟ ۱ر اطاعت رسول ۱ر انتخاب ۱ر (علاوہ محصول ڈاک)

آپ ان پمفلٹوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں منگا کر عوام میں تقسیم کیجئے اور اس طرح قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

سلسلۂ اصلاح وتذکیر

(محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

(۶)

[اس مضمون کی گذشتہ پانچ اقساط میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ اور والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ نیز بھائی بہنوں کو آپس میں کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور اس سلسلہ میں ہر ایک کے فرائض وواجبات کیا ہیں؟ زیر نظر قسط میں یہ بتایا جائے گا کہ میاں بیوی کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے۔ اور ان کے ایک دوسرے پر کیا حقوق وواجبات ہیں۔ لہٰذا ان کو آپس میں کس طرح رہنا چاہیئے۔ طلوعِ اسلام]

میاں بیوی

اب ہم معاشرہ کے اس نازک ترین تعلق تک پہنچ گئے ہیں جسے ازدواجی تعلق کہا جاتا ہے۔ یعنی میاں بیوی کے تعلقات ایک مرد اور ایک عورت کے تعلقات —— عورت —— دستِ قدرت کا حسین ترین شاہکار مگر یہی انسانی معاشرہ میں مظلوم ترین مخلوق۔ یوں کہنے کو تو یہی کہا جاتا ہے کہ دنیا نے ہست وبود میں گرمیٔ محفل ہے تو اسی کی وجہ سے۔ بربطِ ہستی میں جوشِ نغمہ ہے تو اسی کے وجود سے، گلشنِ کائنات میں رنگ وبو ہے تو اسی کے دم قدم سے۔ نبضِ حیات میں حرکت واضطراب ہے تو اسی کی وجہ سے۔ زندگی کے ساز میں سوز ہے تو اسی کے صدقہ سے۔ لیکن کس قدر مظلوم ہے یہ ہستی کہ یہودیت کی تعلیمات میں آدم کو جنت سے نکلوایا تو اسی نے، اور عیسائیت کی تعلیمات میں دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت چیز ہے تو یہی۔ مزدکیت کے فلسفہ میں تین بڑے فتنوں میں سب سے بڑا فتنہ ہے تو یہی۔ ہندوازم میں یہی وہ ناگ ہے جس کے کاٹے کا کوئی منتر نہیں۔ قرآن ہی تو ہے جس نے سب سے پہلے عورت کی اس مظلومیت کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کا وہ مقام اسے عطا کیا جس کی وہ دراصل مستحق تھی۔ قرآن

کریم نے اس تعلق کی تعبیر کے لئے جو لفظ اختیار کیا ہے وہ زَوْجٌ کا لفظ ہے جو عربی زبان کے اعتبار سے مرد پر بھی بالکل اسی طرح بولا جاتا ہے جیسا کہ عورتوں پر۔ اس نے اُسے داسی قرار نہیں دیا۔ بلکہ اسے مرد کا جوڑ قرار دیا ہے۔ یہ تعبیر ہی مرد و زن کے باہمی تعلق کو ظاہر کر دیتی ہے کہ ان دونوں میں مساوات کا تعلق ہے۔ یہ زندگی کی ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں جو ایک دوسرے پر کوئی برتری اور فضیلت نہیں رکھتے۔ یہ ایک ہی صنف اور ایک ہی نوع کی دو چیزیں ہیں۔ جن میں کوئی امتیازی خط نہیں کھینچا جا سکتا۔ عورت اگر مرد کی زوج ہے تو مرد بھی عورت کا زوج ہے۔ لہٰذا دونوں میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔

نفسِ واحدہ سے تخلیق

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝ (۴/۱)

اے لوگو! اپنے نشوونما دینے والے خدا کے قانون سے ہم آہنگ رہو۔ جس نے تمہیں ایک نفس واحد سے پیدا کیا۔ اور اسی نفس واحد سے اس کا جوڑ بھی پیدا کیا۔ اور ان دونوں (مرد اور عورت) سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پیدا کر دیں۔ خدا کے قانون سے جس کا واسطہ دیکر تم آپس میں ایک دوسرے سے اپنی ضروریات پوری کرتے ہو، اور رشتہ داریوں کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہو۔ بلاشبہ خدا تم پر نگراں ہے۔

جیسا کہ مرد کی تخلیق نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے ایسے ہی عورت کی تخلیق بھی اسی نفس واحدہ سے عمل میں آئی ہے۔ لہٰذا یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مرد تو پرماتما کے منہ سے پیدا ہوا تھا۔ اور عورت برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے مرد افضل ہے۔ اور عورت اس سے کمتر ہے۔

بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ

یہ محرف تورات کی افسانہ طرازی ہے کہ پہلے آدم کا پتلا بنایا گیا۔ اور پھر آدم کی پسلی سے اس کی بیوی (حوا) کو پیدا کیا گیا تھا۔ چونکہ پسلی ہمیشہ ٹیڑھی ہوتی ہے جسے سیدھا نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ بالآخر ٹوٹ جاتی ہے۔ اسی طرح عورت بھی فطرۃً ٹیڑھی ہوتی ہے قرآن اس افسانہ کو بیان نہیں کرتا۔ بلکہ وہ کہتا ہے۔

إِنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ ۚ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ ۚ (۳/۱۹۵)

میں کسی کام کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ وہ مرد ہو یا عورت۔ تمہارے بعض تمہارے بعض سے ہیں۔

عورتیں اور مرد دونوں ہی مردوں اور عورتوں دونوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے مرد پیدا ہوا تھا اور

اس مرد سے عورت کی تخلیق عمل میں لائی گئی تھی۔ بلکہ عورت اور مرد دونوں کا وجود ایک ساتھ ہوا تھا۔ جب مرد پیدا ہوا تھا۔ تو اس کے ساتھ ہی عورت بھی پیدا ہو چکی تھی۔ جیسا کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ مرد عورتوں سے پیدا ہوتے ہیں ایسے ہی یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ عورتیں مردوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ مردوں اور عورتوں دونوں کی تخلیق ایک دوسرے سے ہوتی ہے بعضکم من بعض۔ لہٰذا اس چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی تھی یا انڈا پیدا ہوا تھا۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ مردوں اور عورتوں میں تخلیقی اعتبار سے بھی کوئی ایسا امتیاز نہیں ہے جس کی بنا پر ایک کو دوسرے پر فضیلت دی جا سکے۔ تخلیقی اعتبار سے بھی نہ مرد عورتوں سے افضل ہیں۔ اور نہ عورتیں مردوں پر کوئی فوقیت رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے دونوں ایک مرتبہ میں ہیں۔

مرد کی طبیعت میں جوش، ولولہ اور جرأت رکھی گئی ہے۔ اس میں عملی طاقت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں عورت نہایت صابر اور مستقل مزاج ہوتی ہے۔ وہ صبر و استقامت کا پیکر ہوتی ہے۔ مردوں کی طرح شعلہ پا نہیں ہوتی کہ کسی جگہ اسے قرار ہی نہیں ہوتا۔ وہ میں سکون و قرار عورت ہی پیدا کرتی ہے۔ ورنہ اس کی شعلہ صفتی اسے کسی ایک کام کو بھی پایۂ تکمیل تک پہنچانے نہ دیتی۔ مرد جنگل کا ایک ہرن ہے جو ادھر ادھر چوکڑیاں بھرتا پھرتا ہے۔ اسے کسی ایک مقام پر روک کر رکھنے کے لئے جو چیز زنجیر پا ثابت ہو سکتی ہے وہ عورت ہی ہے۔ دنیا میں مرد نے آج تک جس قدر تخلیقی کارنامے انجام دیئے ہیں وہ عورت ہی کے رہین منت ہیں کہ اسی نے اس کو صبر و استقامت کے ساتھ کام پر لگے رہنا سکھایا ہے۔ ورنہ مرد کی شعلہ صفتی اسے کسی کام پر جم کر لگے رہنے دے ہی نہیں سکتی تھی۔

عمل میں دونوں کا حصہ

لہٰذا یہ کہنا کہ فلاں کام فقط مرد نے کیا ہے غلط ہے۔ مرد کے کاموں میں عورتیں بھی برابر کی شریک ہیں۔ خدا نے عمل کی صلاحیتیں مردوں اور عورتوں دونوں میں مساویانہ رکھی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ دونوں کے دائرہ ہائے عمل الگ الگ ہیں اور دائرہ ہائے عمل کے مطابق ہی دونوں کو قدرت کی طرف سے قویٰ عطا کئے گئے ہیں۔ مردوں کے قویٰ میں شدت، قوت اور کرختگی رکھی گئی ہے تو عورتوں کے قویٰ میں نزاکت، لطافت اور لچک رکھ دی گئی ہے۔ کیونکہ دونوں کو اپنے اپنے میدانِ عمل میں انہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن عملی دنیا میں دونوں کے اعمال برابر اپنے اپنے نتائج پیدا کرتے ہیں۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ (۳/۱۹۵)

چنانچہ ان کے نشوونما دینے والے نے ان کی بات سن لی کہ میں کسی کام کرنے والے کا عمل ضائع جانے نہیں دوں گا۔ خواہ وہ کام کرنے والا مرد ہو یا عورت۔ جو ایک دوسرے ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔

دنیا میں بڑے سے بڑے کارہائے نمایاں انجام دینے والے علماء، حکما، امرا، صناع اور موجدوں کے کارناموں پر غور کرو اور ان کی زندگی کا مطالعہ کرو۔ کیا یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اگر انھیں ان ماؤں کی آغوشِ تربیت میسر نہ آتی جن کی گود میں وہ پروان چڑھے تھے تو کیا وہ ان کارہائے نمایاں کو سرانجام دینے کی صلاحیت بھی رکھ سکتے تھے۔ کیا ایک ریڈیو کے موجد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے، اس ہستی کو فراموش کیا جا سکتا ہے جو اس ریڈیو کے موجد کو جنم دینے والی تھی۔ یقیناً ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ کیا ایک فاتح کی عظیم فتوحات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس عظیم المرتبت ماں کو بھلایا جا سکتا ہے جس نے اتنا بڑا فاتح پیدا کیا۔ اور پھر اسے ذہنی اور عملی تربیت دیکر پروان چڑھایا۔ لاریب ایسا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا

عورتیں خود تم میں سے ہیں

عورت اور مرد ایک ہی نوع کی دو صنفیں ہیں۔ وہ مردوں سے الگ کوئی نوع نہیں ہیں جس ماں باپ سے لڑکے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی ماں باپ سے لڑکیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ جس درخت کا پھل لڑکے ہیں اسی درخت کا پھل لڑکیاں بھی ہیں۔ جس کھیت کی پیداوار لڑکے ہیں اسی کھیت کی پیداوار لڑکیاں بھی ہیں۔ پھر مردوں اور عورتوں کے درمیان امتیازی خطوط کھینچنا اور ایک کو افضل اور دوسرے کو کمتر قرار دینا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۝ (۱۶/۷۲)

اور خدا نے تمہارے لئے تمہارے جوڑے خود تمہارے نفسوں ہی سے پیدا کئے ہیں۔ اور پھر تمہارے ان جوڑوں سے تمہارے لئے تمہارے بیٹے اور دوسرے مددگار (پوتے نواسے پڑپوتے پڑنواسے وغیرہ) بنائے ہیں اور تمہیں عمدہ اور مرغوب چیزوں سے رزق دیا ہے۔

ایک دوسرے پر فضیلت

یہ ضرور ہے کہ بعض قوتیں مردوں میں زیادہ ہیں اور بعض قوتیں عورتوں میں زیادہ ہیں۔ دنیوی زندگی کی کامیابیاں دونوں قسم کی قوتوں کی متقاضی ہیں۔ اس لئے کارگہ عمل میں نہ مرد تنہا کافی ہو سکتا ہے اور نہ عورت تنہا کافی ہو سکتی ہے۔ جو کمی مردوں میں ہے۔ وہ عورتیں پوری کرتی ہیں اور جو کمی عورتوں میں ہے۔ وہ مرد پوری کرتے ہیں اس طرح دونوں ہی ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اپنی اپنی قوتوں کے مطابق دونوں کے عملی میدان الگ الگ ہیں اپنے اپنے میدان میں ہر ایک کو کام کرنا چاہیئے۔ اور باہمی تعاون و تناصر سے زندگی کی اس گاڑی کو کھینچنا چاہیئے۔ اس میں منافست اور مقابلہ نہیں ہونا چاہیئے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَاسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (۴/۳۲)

جن قوتوں میں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ان کے متعلق آرزو نہیں نہ کرو۔ مردوں کے لئے ان اعمال کا حصہ ہے جو وہ کرتے ہیں۔ اور عورتوں کے لئے ان اعمال کا حصہ ہیں جو وہ کرتی ہیں اور اللہ سے اس کا فضل طلب کرتے رہو۔ یقیناً خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔

مرد اگر حکومتوں کا انتظام کرتا ہے، فوجوں کی کمان کرتا ہے۔ ریڈیو۔ ہوائی جہاز۔ ایٹم بم اور ٹیلیویژن کی تخلیق کرتا ہے۔ تو عورت پوری انسانیت کی تخلیق کرتی ہے۔ وہ ان بادشاہوں اور کمانڈروں کو جنم دیتی ہے اور پال پوس کر جوان کرتی ہے۔ جو آگے چل کر کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں۔ وہ ان موجدوں کو پیدا کرتی ہے جن کی اختراعات کا غلغلہ پوری دنیا میں تہلکہ ڈال دیتا ہے

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

اگرچہ تاریخ ایسی عورتوں کو بھی پیش کرتی ہے جنھوں نے نہ صرف 'مکالماتِ فلاطوں' ہی لکھے ہیں بلکہ جنھوں نے بادشاہتیں کیں۔ ملکوں کے انتظامات کئے۔ فوجوں کی کمانیں کیں اور ہر وہ کام سرانجام دیئے جو مرد کرتے ہیں لیکن جو کام فطرت نے عورت کے سپرد کیا ہے اسے کوئی مرد بھی سرانجام نہیں دے سکتا۔

لہٰذا دائرہ عمل کے اس اختلاف کی وجہ سے کسی ایک کی فضیلت اور دوسرے کی کمتری کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

حقوق ملکیت و وراثت

بعض قوموں میں عورتوں کو ملکیت کے حقوق حاصل نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ آج بھی بہت سی مہذب اور متمدن قومیں ایسی موجود ہیں جن کے ہاں عورتیں ان حقوق سے محروم ہیں لیکن قرآن کریم نے عورتوں کے متعلق اس قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ قرآنی معاشرے میں جن چیزوں پر مردوں کو ملکیتی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان پر عورتوں کو بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ عورتیں اپنی محنت اور مشقت سے حاصل کریں۔ وہ اسے بھی اپنے شوہروں کے حوالہ کر دیں جیسے مرد اپنی کمائی کے مالک ہوتے ہیں ایسے ہی عورتیں بھی اپنی کمائی کی مالک ہوتی ہیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (۴/۳۲)

مردوں کے لئے اس میں سے حصہ ہے جو مرد کماتے ہیں اور عورتوں کے لئے اس میں سے حصہ ہے جو کچھ وہ کماتی ہیں۔

ایسے ہی ماں باپ یا دیگر اعزا جو کچھ چھوڑ کر مر جاتے ہیں ان کا ترکہ جیسا کہ مردوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ایسے ہی عورتوں میں بھی تقسیم ہوگا۔ البتہ چونکہ عورتوں کی معاشی ذمہ داریاں زیادہ نہیں ہوتیں۔ اس لئے عورتوں کا حصہ مردوں کی بہ نسبت آدھا رکھا گیا ہے اسی اصول کے ماتحت اگر بیوی مر جائے تو جیسا اس کا شوہر بیوی کے ترکہ میں وارث ہوتا ہے۔ ایسے ہی اگر شوہر مر جائے تو اس

کے ترکہ میں سے اس کی بیوی بھی وارث ہوتی ہے۔ اگرچہ بیوی کا حصہ شوہر کے حصہ سے نصف ہوتا ہے۔ جس کی وجہ وہی معاشی ذمہ داریوں کی کمی ہے۔

اچھے اعمال کی صلاحیت

دنیا میں جس قدر صلاحیت بخش کام ہو سکتے ہیں۔ ان کی صلاحیت اور قدرت جیسے مردوں کو حاصل ہوتی ہے ویسے ہی عورتوں کو بھی حاصل ہوتی ہے۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اطاعت وفرمانبردار بن سکتے ہیں تو بعینہٖ یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے۔ اگر مرد دنیا کی قوموں کو امن وسلامتی دلا سکتے ہیں تو یہ کام عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔ اگر مرد کسی کام پر اپنی تمام توجہات مرکوز کر سکتے ہیں تو یہ چیز عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔ اگر مرد اپنے دعاوی کو سچا کر دکھا سکتے ہیں اور سچائی کا بول بالا کر سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں۔ اگر مرد کسی مقصد پر صبر واستقامت کے ساتھ جم سکتے ہیں تو اس کا مظاہرہ عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔ اگر حق کے سامنے مرد شاخ ثمردار کی طرح جھک سکتے ہیں تو یہ چیز یں عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔ اگر صدقہ اور خیرات مرد کر سکتے ہیں تو عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔ اگر مرد کسی موقعہ پر رُک سکتے ہیں تو یہی بات عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔ اگر اپنے جوہر عفت وعصمت کی حفاظت مرد کر سکتے ہیں تو عورتیں بھی اس خصوصیت میں مردوں سے فروتر نہیں ہیں۔ اگر قانونِ خداوندی کی نگہداشت مرد کر سکتے ہیں۔ تو عورتیں بھی اس میدان میں مردوں سے پیچھے رہ جانے والی نہیں ہے۔ سورۂ احزاب میں ہے

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ۝ (۳۳/۳۵)

بلاشبہ اطاعت کرنیوالے اور اطاعت کرنے والیاں۔ ایمان لانے والے اور ایمان لانے والیاں ہمہ تن متوجہ ہونے والے اور متوجہ ہو جانے والیاں۔ سچ کر دکھانے والے اور سچ کر دکھانے والیاں۔ استقامت کا مظاہرہ کرنے والے۔ اور استقامت کا مظاہرہ کرنے والیاں، جھک جانے والے اور جھک جانے والیاں۔ صدقہ کرنے والے اور صدقہ کرنیوالیاں۔ روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں۔ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنیوالے اور حفاظت کرنے والیاں۔ قانون الٰہی کو پیش نظر رکھنے والے اور رکھنے والیاں۔ خدا نے ان سب کے لئے سامانِ حفاظت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

یہ وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک قرآنی معاشرے میں ضرور پائی جانی چاہئیں۔ اور یہ خوبیاں جیسا کہ مردوں میں پائی جا سکتی ہیں بعینہٖ

اسی طرح عورتوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا عملی صلاحیت کے اعتبار سے بھی دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح دونوں

مساوی حقوق

کے حقوق و واجبات میں بھی کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ عورتوں کے حقوق جیسا کہ مردوں کے ذمہ ہوتے ہیں ایسے ہی مردوں کے کچھ حقوق عورتوں کے ذمہ ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ مردوں کے تو عورتوں پر حقوق ہوں۔ مگر عورتوں کے مردوں پر کچھ بھی حقوق نہ ہوں۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲/۲۲۸)

عورتوں کے بھی ایسے ہی حقوق ہوتے ہیں، جیسا کہ مردوں کے ان پر حقوق ہوتے ہیں یہ حقوق معروف کے مطابق ہوتے ہیں۔

مَعْرُوفٌ کے معنی ہیں جانے پہچانے ہوئے۔ متعارف اور مسلّم یعنی (RECOGNISED) ان امور کا مدار ملک اور قوم کے رسم و رواج اور تعارف پر ہوتا ہے۔ ایک ملک اور ایک قوم میں جو حقوق و واجبات مردوں کے ذمہ تسلیم کئے جاتے ہیں ضروری نہیں کہ ہر ملک اور ہر قوم میں مردوں کے ذمہ وہی حقوق و واجبات ہوتے ہوں۔ ایسے ہی عورتوں کے ذمہ ایک ملک یا ایک سوسائٹی میں جو حقوق و واجبات تسلیم کئے جاتے ہیں ضروری نہیں ہے کہ ہر ملک اور ہر سوسائٹی میں ویسے ہی حقوق و واجبات عورتوں کے ذمہ تسلیم کئے جاتے ہوں۔

ہوسکتا ہے کہ کسی ملک اور سوسائٹی میں کھانا پکانا، برتن دھونا، گھر کی صفائی کرنا، پانی بھرنا، کپڑے صاف کرنا، بچوں کی پرورش کرنا عورتوں کے فرائض و واجبات میں داخل سمجھے جاتے ہوں۔ مگر دوسرے ملک یا کسی دوسری سوسائٹی میں (وہاں کے مخصوص معاشی تقاضوں کے ماتحت) یہ چیزیں عورتوں کے فرائض و واجبات میں داخل نہ سمجھی جاتی ہوں ایسے ہی ہوسکتا ہے کہ کسی ملک اور سوسائٹی میں کھانا پکانے کے لئے باورچی کا انتظام کرنا یا تیار کھانے کا کسی ہوٹل سے بندوبست کرنا، برتن دھونے اور گھر کی صفائی کرنے کے لئے کسی ملازم کا انتظام کرنا، پانی بھرنے کے لئے کسی سقہ یا بہشتی کو مقرر کرنا بچوں کو دودھ پلانے اور کھلانے کے لئے آیا اور دایہ کا انتظام کرنا مردوں کے فرائض و واجبات میں شمار ہوتا ہو مگر کسی دوسرے ملک یا دوسری سوسائٹی میں اس کے برعکس ہو۔ لہٰذا قرآن کریم ایسے جزئی معاملات کے لئے کسی ایک صورت کو متعین نہیں کرتا بلکہ ان چیزوں کو ملک اور سوسائٹی کے مروجہ دستور اور طریق کار پر چھوڑ دیتا ہے۔ کسی قوم یا سوسائٹی میں جو طریق کار مروج ہے۔ وہی اس قوم یا سوسائٹی کے لئے طریق معروف کہلائے گا۔ لہٰذا حقوق و واجبات کے ذیل میں ہمیں اپنے ملک اور اپنی سوسائٹی کے طریق کار کو دیکھنا ہوگا۔ اور اس کی پابندی کرنی ہوگی۔ البتہ یہ دیکھ لینا ضروری ہوگا کہ ہمارے ہاں کا کوئی رواج عدل عمرانی کے خلاف تو نہیں کیونکہ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ ہم عدل و انصاف کو کسی وقت بھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ لہٰذا اگر ہمارے ملک یا ہماری سوسائٹی کا کوئی رواج عدل و قسط کے میزان پر پورا نہیں اترتا تو ایسے رواج کی اصلاح کرنا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً ہمارے یہاں (انڈو پاکستان کے) مسلمانوں میں مشترکہ

خاندانی معیشت (JOINT FAMILY SYSTEM) کا طریقہ رائج ہے اور اس سسٹم میں ساس سسر اور نندوں کو بہوؤں پر آمرانہ و مالکانہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ بہو کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ پورے خاندان کی خدمت کرتی کرتی زمین کا پیوند ہو جائے ان کی طعن و تشنیع دن رات سنتی رہے اور زبان سے اُف تک نہ کرے۔ جو کچھ وہ کھلادیں وہ کھالے اور جو کچھ وہ پہنادیں وہ پہن لے۔ اس کی حیثیت مکان میں ایک زرخرید لونڈی سے زیادہ نہیں ہوتی بے شک یہ ہمارے ملک کا رواج ہے ہماری سوسائٹی میں اس طرز معیشت کو مسلّمہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے لیکن چونکہ یہ عدل و قسط کے خلاف ہے۔ اس لئے اسے معروف نہیں کہا جا سکتا۔

ساس اور سسر کے آمرانہ اختیارات

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ (۴/۱۳۵)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! عدل و انصاف کو عمدگی کے ساتھ قائم رکھنے والے بنو۔ اور خدا کی طرف سے نگراں بن کر رہو خواہ یہ نگرانی خود تمہاری ذات کے خلاف پڑتی ہو یا والدین کے خلاف یا دوسرے رشتہ داروں کے خلاف۔

لہٰذا ایسے غلط رواج کو چھوڑنا یا اس میں ایسی ضروری اصلاح کرنا نہایت ضروری ہے۔ جس سے وہ عدل و قسط کے اندر آجائے۔ اور کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے بیوی (بہو) کی حق تلفی یا اس پر ظلم ہوتا ہو۔

مختصراً یہ کہ قرآن کی رو سے معروف اس طرز معاشرت کو کہیں گے جو قانونِ خداوندی کے خلاف نہ ہو۔ کہیں اس کے معنی خود قانون خداوندی کے بھی ہوں گے۔

نکاح ایک معاہدہ ہے

قرآن کی رو سے نکاح دو آزاد (مرد و عورت) برابر کے افراد کا باہمی رضامندی سے ایک معاہدہ ہے کہ وہ ازدواج کی زندگی بسر کریں گے۔ صرف معاہدہ ہی نہیں بلکہ بہت ہی سخت قسم کا معاہدہ ہے۔ قرآن کریم نے اس معاہدہ کو "میثاق غلیظ" سے تعبیر کیا ہے (۴/۲۱) دوسری جگہ اس معاہدہ کو عُقْدَةَ (گرہ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء میں ہے کہ۔

وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ (۲/۲۳۵)

اور (طلاق دی ہوئی عورت سے) عقدِ نکاح (معاہدہ نکاح) کا اس وقت تک ارادہ نہ کرو جب تک اس کی عدت کی مدت پوری نہ ہو جائے۔

اسے "میثاق غلیظ" کہئے یا "عقدہ نکاح" بہرحال قرآن کی رو سے یہ ایک معاہدہ ہے جو برابر کے دو فریقوں میں ہوتا ہے۔ لہٰذا مرد اور عورت دونوں کا عاقل و بالغ ہونا ضروری ہے۔ یعنی دونوں میں اتنی صلاحیت ہونی چاہیئے کہ وہ اس معاہدہ کے مالہٗ و

صِغر سنی کی شادی جائز نہیں

ماعلیہ کو سمجھ سکیں، جن ذمہ داریوں کو وہ قبول کر رہے ہیں، ان کا احساس کر سکیں۔ دو نابالغوں یا ایک بالغ اور ایک نابالغ کے درمیان میں کوئی معاہدہ نہیں ہو سکتا معاہدہ قانونی حیثیت سے اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ دو عاقل و بالغ افراد کے درمیان اپنے دل کی مرضی سے ہوا ہو۔ ایک عاقل و بالغ اور دوسرا مجبور و معذور، ہو تو قانونی نگاہ میں اس معاہدہ کی اصلاً کوئی حیثیت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بلوغ کو نکاح کی عمر قرار دیا ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ (۴/۶)

جو یتامیٰ عقل سے بیگانہ ہوں انھیں اپنے اموال سپرد نہ کر دیا کرو جنھیں خدا نے تمہارے لئے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا ذریعہ بنایا ہے البتہ ان اموال میں ان کو کھلاتے پہناتے رہو اور ان سے مناسب باتیں کرتے رہو۔ یتامیٰ کی آزمائش کرتے رہا کرو حتیٰ کہ جب وہ نکاح کی عمر (بلوغ) کو پہنچ جائیں تو اگر اس کے بعد تم ان میں معاملات کی سمجھ بوجھ محسوس کرو تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو۔

آیت مذکورہ بالا میں مسئلہ یہ بیان ہوا ہے کہ اگر یتیم بچے تمہاری تربیت میں ہوں اور ان کے اموال تمہارے قبضہ میں ہوں اور وہ عقل و شعور سے بیگانہ ہوں تو ان کے اموال ان کے حوالہ نہ کر دو بلکہ ان کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے۔ ان اموال میں سے تم ان کی ضروریات پر خرچ کیتے رہو۔ اور ان کے عقل و شعور کی جانچ کرتے رہو تاآنکہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں یعنی بالغ ہو جائیں تو اس کے بعد دیکھو۔ اگر ان میں معاملات کی سوجھ بوجھ آگئی ہے۔ اور یہ خدشہ نہیں ہے کہ وہ مال کو ضائع اور برباد کر دیں گے تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دینے چاہئیں۔ اس مسئلہ کے ضمن میں قرآن نے ہمیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ نکاح کی عمر کیا ہوتی ہے۔ یہاں قرآن نے ضمناً یہ چیز بھی واضح کر دی ہے کہ نکاح کی عمر بالغ ہو جانا ہے۔ اگرچہ یتامیٰ کو ان کے اموال حوالہ کرنے کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ وہ بالغ ہو جائیں۔ بلکہ اس کے بعد یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ان میں رشد و صلاحیت بھی پیدا ہوگئی ہے یا نہیں لیکن اس سے تو کسی طرح بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ قرآن کریم کی اس آیت نے نکاح کی عمر بلوغ کو مقرر کیا ہے۔

شبہات کا ازالہ

جو لوگ صغر سنی کی شادی کو جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے پاس قرآن کریم کی اس صریح آیت کا کوئی جواب نہیں ہے۔ وہ ان روایات کی پناہ لیتے ہیں۔ جو صغر سنی کے نکاح سے متعلق کتب احادیث میں ملتی ہیں اور سب سے زیادہ حضرت عائشہؓ کے نکاح کو پیش کیا جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں کو کون بتائے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضور اکرم صلعم کا نکاح مکہ مکرمہ میں حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد ہوا تھا اور آیت

مذکورہ بالا بات اتفاق مدنی ہے۔ لہٰذا وہ نکاح اس حکم کے نازل ہونے سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اگرچہ بعض روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن سے حضرت عائشہؓ کی عمر شادی کے وقت کم از کم پندرہ سولہ سال معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ روایات صحیح ہوں تو یہ واقعہ صغر سنی کی شادی کے جواز کے لئے دلیل ہی نہیں ہو سکتا[1]۔ سوچنے کی بات ہے کہ نکاح جب قرآن کی رو سے ایک معاہدہ ٹھہرا تو معاہدہ تو فریقین کی رضامندی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اور رضامندی کے لئے خود فریقین کا عاقل و بالغ ہونا ضروری ہے ماں باپ یا کسی رشتہ دار کو یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ جبراً اولاد کا نکاح کر دیں۔ کہا جاتا ہے کہ بسا مرتبہ ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ ایک وقت لڑکی کے لئے مناسب شوہر مل رہا ہے جو شاید کل نہ مل سکے یا ماں باپ ضعیف ہیں انھیں یہ اندیشہ ہے کہ وہ اولاد کے جوان ہونے تک زندہ نہ رہ سکیں اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ اس کا فیصلہ وہ اپنی زندگی ہی میں کر جائیں تاکہ ان کے بعد ان کی اولاد دوسروں کی ٹھوکروں میں نہ رہے وہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ لیکن یہ حضرات اتنا نہیں سوچتے کہ مناسب بر ملنا یا نہ ملنا۔ اولاد کے بلوغ کے وقت ماں باپ کا زندہ رہنا یا نہ رہنا یہ تمام خدشے اور اندیشے محض اسی وجہ سے تو پیدا ہوتے ہیں کہ ماں باپ یا دیگر رشتہ داروں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ مناسب اور نامناسب بر کا فیصلہ کرنا اور شادی کی رسم کو انجام دینا ہمارا فرض یا ہمارا حق ہے۔ آج ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں لڑکا ہماری لڑکی کے لئے موزوں اور مناسب ہوگا لیکن ہو سکتا ہے کہ جب لڑکی جوان ہو جائے تو وہی بر آپ کی لڑکی کے لئے ناموزوں ثابت ہو۔ جو چیز آپ کے سوچنے کی نہیں ہے آپ خواہ مخواہ اسے سوچتے کیوں ہیں؟ آپ کا دل تو یہ بھی چاہتا ہوگا کہ آپ کی اولاد آپ کے سامنے ہی کسی سرکاری معزز پوسٹ پر فائز ہو جائے تو کیا محض اس اندیشہ سے کہ کل کو بچے جوان ہوں گے تو شاید اس وقت ہم زندہ نہ ہوں اور بچے لوگوں کی ٹھوکروں میں نہ رہیں تو کیا آپ اسکی بھی کوشش کریں گے کہ آپ کے لڑکے اور لڑکیاں آج ہی سے بلند بلند عہدوں پر فائز کر دی جائیں۔ خواہ ابھی انھوں نے تیسری جماعت کا امتحان بھی پاس نہ کیا ہو لیکن ظاہر ہے کہ سرکاری ملازمت تو امتحانات پاس کرنے۔ مقررہ معیار قابلیت بہم پہنچانے اور ایک خاص عمر تک پہنچ جانے کے بعد ہی ان کو مل سکیگی۔ اس لئے آپ ایسی باتیں کبھی نہیں سوچتے۔ اسی طرح اگر ہمارے ذہنوں سے یہ بات نکل جائے کہ اولاد کی شادیاں کرنا ہمارا فریضہ یا ہمارا حق ہے تو یقیناً ہمیں اپنے نعیفی کے زمانے میں یہ خیالات بھی نہیں ستائینگے یاد رکھیئے! قانون کبھی ہماری آرزوؤں اور تمناؤں کے تابع نہیں ہو سکتا۔ اور پھر خدا کا قانون؟

جبراً شادی نہیں کی جا سکتی

اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے کہ نکاح قرآن کی رو سے ایک معاہدہ ہے ظاہر ہے کہ معاہدہ باہمی رضامندی اور دل کی خوشی سے ہو سکتا ہے جبراً نہیں ہو سکتا۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں جہالت کی وجہ سے اس کا قطعاً خیال نہیں رکھا جاتا۔ پچاس فیصدی شادیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں

---

[1] اس موضوع پر زیر نظر اشاعت میں ایک اہم مضمون "حضرت عائشہ کی عمر" شائع ہو رہا ہے۔ اس لئے اس موضوع پر یہاں تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس موضوع کو وہاں دیکھ لیں۔

ہیں لڑکیوں کی رضامندی حاصل کرنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی جاتی۔ ایسی مثالیں بھی سامنے آئی ہیں کہ ماں باپ کو یہ معلوم ہو جانے کے بعد بھی کہ ان کی لڑکی فلاں جگہ شادی کرنے پر راضی نہیں ہے اس کی مرضی کو کوئی وزن نہیں دیا جاتا اور جہاں خود ان کی اپنی مرضی ہوتی ہے وہاں زبردستی لڑکی کو دھکیل دیا جاتا ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکی کا باپ مر گیا ہے اور اس کا چچا اس کا ولی ہے۔ وہ اس لڑکی کے مال و دولت پر قبضہ جمانے کے لئے اپنے کسی نکھٹو لڑکے سے زبردستی اس کی شادی کر لیتا ہے۔ حالانکہ لڑکی ایسے لڑکے کے ساتھ شادی کرنے پر قطعاً رضامند نہیں ہوتی۔

بعض مرتبہ ایسی صورتیں بھی پیش آجاتی ہیں کہ ایسی بیوہ اور یتیم لڑکیوں کو جبراً شادی کرنے سے باز رکھا جاتا ہے جن کے شادی کر لینے سے کچھ مال یا زمین و جائداد کے ان کے قبضے سے نکل جانے کا اندیشہ ہو۔ بہرحال یہ ساری صورتیں جبر و اکراہ کی ہیں۔ اور قرآن کریم کی اس آیت کے مطابق قطعاً جائز نہیں ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ
وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ
بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ
أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (۴/۱۹)

اے پیروان دعوت ایمانی! تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن جاؤ اور عورتوں کو نکاح کرنے سے نہ روکو تاکہ اس طرح تم اُن کے مال کے ایک حصہ پر قبضہ کر سکو جو تم نے انھیں دیا تھا۔ البتہ اگر وہ کوئی کھلی ہوئی بے حیائی کی بات کی مرتکب ہوں تو تم ان کو روک سکتے ہو۔ ان کے ساتھ متعارف و معروف (RECOGNISED) طریقہ پر رہن سہن رکھو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند بھی ہوں تب بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرتے ہو۔ مگر خدا نے اس میں تمہارے لئے بہت بھلائی رکھ دی ہو۔

لہٰذا اس آیت کی رُو سے وہ تمام صورتیں ناجائز ہیں جن کے ذریعہ سے عورتوں پر یا ان کے اموال پر جبراً تسلط حاصل کیا جاتا ہو صغر سنی کا نکاح بھی جس میں نابالغ لڑکی کی مرضی شامل نہیں ہوتی اس آیت کے عموم میں داخل ہے۔ اور اس بنا پر وہ بھی ممنوع اور ناجائز ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بھی عورتوں پر جبراً قبضہ کیا جاتا ہے۔

اشتہار برائے حصول ملازمت:- میں ایک نوجوان لڑکا ہوں میری قابلیت مڈل تک ہے۔ حالات نے مجھے تعلیم کی بجائے ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ محنت اور دیانتداری کی ضمانت دلا سکتا ہوں ضرورت مند حضرات پتہ ذیل پر مطلع فرمائیں۔
ق - ا - معرفت ادارہ طلوع اسلام۔

طلوعِ اسلام کنونشن

آخری اعلان

طلوع اسلام کنونشن کے متعلق اگست۔ ستمبر۔ اکتوبر کے شماروں میں بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے شائع شدہ اعلانات قارئین کی نظر سے گذر چکے ہوں گے۔ چونکہ نومبر کا شمارہ آخری ہوگا۔ جس میں کنونشن کے متعلق مزید تفصیلات قارئین تک بروقت پہنچ سکیں۔ اسلئے سکریٹری بزم طلوع اسلام لاہور نے مفصل پروگرام ہدایات برائے نمائندگان بزم ہا و دیگر مدعوئین مرتب کی ہیں جنھیں درج ذیل کیا جاتا ہے۔

تواریخ وجائے انعقاد

مغربی پاکستان کی بزم ہائے طلوع اسلام کے نمائندگان کا ایک مشاورتی اجتماع (کنونشن) ۱۶، ۱۷، ۱۸ نومبر (جمعہ ہفتہ۔ اتوار) کو لاہور میں منعقد ہوگا۔ احباب کی خواہش کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ اس مختصر سے قیام میں زیادہ سے زیادہ وقت اجتماعی رنگ میں گذارا جائے۔ اس لئے جملہ نمائندگانِ بزہائے طلوع اسلام اس اجتماع میں "کیمپ لائف" بسر کریں گے۔ کنونشن دارالقرآن شالامار ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوگی جو پاکستان منٹ کے دروازے کے سامنے جی۔ ٹی روڈ پر واقع ہے۔

باہر سے تشریف لانے والے احباب کی سہولت کے لئے پندرہ تاریخ بروز جمعرات بزم طلوع اسلام لاہور کے رضاکاران بازو پر "کنونشن طلوع اسلام" کا نشان لئے ہوئے لاہور اسٹیشن پر موجود ہوں گے۔ اور دارالقرآن شالامار ٹاؤن کے قریب بھی رضاکاران رہنمائی کے لئے موجود ہوں گے۔ تمام مہمانان (جن کے نام دعوت نامے جاری کئے جا چکے ہیں یا عنقریب جاری کئے جائیں گے) سے درخواست ہے کہ وہ اپنی آمد کی اطلاع سکریٹری بزم طلوع اسلام ۴۴ نسبت روڈ لاہور کو دس نومبر تک ضرور پہنچا دیں۔

انتظام رہائش وخورد ونوش

جملہ مدعوئین کی رہائش وخوراک کا انتظام بزم طلوع اسلام لاہور کریگی۔ ہر مقامی بزم کے دو نمائندے جو کنونشن میں شمولیت کے لئے بطور مندوب (DELEGATES) آئینگے۔ ان کے خورد ونوش ورہائش کا خرچ بذمہ بزم لاہور ہوگا۔ ان کے علاوہ دیگر مدعوئین کے خورد ونوش ورہائش کا انتظام بھی بزم لاہور کریگی۔ لیکن ان حضرات سے دس روپے فی کس خرچ لیا جائے گا۔ دورانِ کنونشن میں جملہ مدعوئین کے پاس دعوتی کارڈ (بطور شناختی نشان) ہونا ضروری ہوگا۔ اسے تاکید آیاد رکھیئے۔

ایجنڈا اور پروگرام (مشروط)

ایجنڈا بنیادی طور پر مندرجہ ذیل عنوانات پر مشمول ہوگا۔ لیکن ان کے علاوہ دیگر تجاویز جو بعض قارئین اور بزموں کی طرف سے موصول ہوئی ہیں۔ اُن پر بھی غور و خوض ہو سکے گا۔

(۱) مرکز کی تاسیس۔

(۲) مرکزی فنڈ کا قیام۔

(۳) شعبۂ نشر و اشاعت اور پریس کا قیام۔

(۴) قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے لائحۂ عمل۔

(۵) مرکزی و مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے قواعد و ضوابط کی ترتیب۔

بروز جمعہ ۔ ۱۶ر نومبر

صبح۔ باہمی تعارف۔ جنرل میٹنگ جس میں سکریٹری بزم طلوع اسلام لاہور ایڈریس پیش کرینگے۔ صدر کا انتخاب ہوگا۔ اور ایجنڈا کی مختلف مدات پر غور کرنے کیلئے سب کمیٹیاں مقرر کی جائینگی۔ نماز جمعہ دار القرآن نسبت روڈ میں ادا کی جائے گی۔ جس میں محترم پرویز صاحب خطبہ دیں گے۔ شام کو سبجکٹس کمیٹی اور دوسری سب کمیٹیوں کے اجلاس ہونگے۔

ہفتہ ۔ ۱۷ر نومبر

صبح۔ جنرل میٹنگ جس سے محترم پرویز صاحب خطاب کریں گے۔ شام۔ جنرل میٹنگ۔

اتوار ۔ ۱۸ر نومبر

صبح۔ دار القرآن (نسبت روڈ) درس قرآن از محترم پرویز صاحب (۲) الوداعی میٹنگ۔

محترم پرویز صاحب کے متعلق ایک ضروری اعلان۔

کونشن میں شریک ہونیوالے احباب کے اصرار پر محترم پرویز صاحب نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ کونشن کے بعد چند روز کے لئے (سابقہ) پنجاب اور سرحد کے مختلف مقامات کا دورہ کرینگے۔ بجائے اس کے کہ اس دورہ کے متعلق پروگرام کونشن کے موقعہ پر طے ہو بہتر ہے کہ متعلقہ حضرات اسکے متعلق پہلے ہی ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی۔ کو لکھدیں تاکہ مختلف مقامات کو سامنے رکھ کر پروگرام متعین کر دیا جائے۔ اس امر کی اطلاع دس نومبر سے قبل آجانی چاہیئے۔

طلوع اسلام کی طرف سے بزموں کیلئے (۱) اگر آپ ادارے سے کچھ کتابیں یا پمفلٹ منگانا چاہتے ہیں تو اسکی بابت ہمیں ۱۰ر نومبر تک اطلاع دیدیں ہم آپکی مطلوبہ کتابیں ذخیرہ لاہور لے آئینگے اور کونشن میں آپ کے نمائندہ سے قیمت وصول کر کے اسکے حوالے کر دینگے۔ اسطرح آپکے ڈاک یا ریل کے خرچ کی بچت ہو جائیگی۔

(۲) محترم پرویز صاحب کا کونشن کے نام خطاب الگ پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ خطاب اہم اور جامع ہوگا اسلئے اسکی عام اشاعت کی ضرورت ہے۔ آپ ہمیں دس نومبر سے پہلے پہلے اطلاع دیدیں کہ آپ کو کتنی کاپیاں درکار ہونگی یہ بھی کونشن کے موقع پر آپکے نمائندہ کو دیدی جائینگی۔ (۳) ماہ رواں کے لمعات جن کا عنوان "انتخاب" ہے پمفلٹ کی صورت میں علیحدہ بھی شائع کرائے گئے ہیں چونکہ یہ مسئلہ موجودہ سیاسی حالات سے تعلق رکھتا ہے اسلئے اس کو عوام میں بیش از بیش تقسیم کرنے کی ضرورت ہے

آپ نے کبھی سوچا؟

شگفتگی، طراوت اور تبسم کے پیچھے کیا کار فرما ہے!
گرم دوڑتا ہوا لہو۔ اگر وہ ذرا بھی سرد ہو جائے تو آپ زرد پڑ جاتی ہیں۔
اس کی وجہ؟ آپ کی استعمالی اغذیہ میں اہم حیاتین کی شدید کمی۔ اس خطرے کے تدارک کیلئے آپ کو مرغن غذاؤں کی نہیں بلکہ ....

وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب)

کی ضرورت ہے جسے آپ کی صحت، توانائی اور تازگی کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اپنی شگفتگی کو برقرار رکھنے کے لئے آج ہی وِم وائٹ خریدیئے۔
ایک گرانقدر طبی تحفہ۔ ایک حیرت انگیز سائنسی تجربہ۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوا فروش سے ملتا ہے۔

آپ رشک کرتے ہیں!

کسی مضبوط اور متناسب جسم کو دیکھ کر۔ کیونکہ آپ لاغر ہیں! اچھی صحت کے اسباب ڈھونڈے نہیں پڑتے۔ آیئے ہم آپ کی مشکل حل کریں۔ کیا آپ اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی غذا نظام جسمانی کی طبعی ضروریات کو پورا کر رہی ہے؟ کیا آپ کو حیاتین ٹھیک طور پر مہیا ہو رہی ہیں؟ یقیناً کوئی تشفی بخش جواب آپ کے پاس نہیں۔

وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب)

ایک گرانقدر طبی تحفہ۔ ایک حیرت انگیز سائنسی تجربہ آپ کی مشکل کا حل ہے۔ جسے استعمال سے آپ تیزی سے ایک توانا اور قابل رشک صحت تعمیر کر سکیں گے۔
وِم وائٹ آپ کی صحت کا ضامن۔ امریکہ میں بنا ہوا ہر دوا فروش سے ملتا ہے۔

اپنے بچے کو آپ صحتمند، توانا اور بشاش دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے آپ صحت افزا اور مقوی اشیا کی تلاش کرتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر بچے اپنے ماں باپ سے ورثہ میں ناقص خون پاتے ہیں۔ یا پھر بالخصوص ماں کے دودھ سے محروم رہتے ہیں۔ اور بازاری دودھ کے سہارے پروان چڑھتے ہیں۔ ان صورتوں کے علاوہ بھی ان کی صحت ضروری حیاتین کی کمی کے باعث ناقص رہتی ہے اور کوئی بھی مرض غلبہ پا سکتا ہے۔

بچہ کو ان تمام خدشات سے محفوظ رکھنے کے لئے

وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب) خریدیئے

وِم وائٹ جو ان تمام چیزوں کے پیش نظر تیار کیا گیا ہے صحت کی مکمل ضمانت ہے۔
آپکے بچے کے اندرونی نظام کا محافظ۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوا فروش سے ملتا ہے۔

ہم اپنے
دو نئے
صابون
پیش کرتے ہیں
صابون خانگی ضرورت کی چیز ہے
کپڑے دھونے اور غسل کرنے کیلئے کوئی
نہ کوئی صابون ضرور استعمال ہوتا ہے
صابون وہی اچھا ہوتا ہے جو زیادہ صفائی
پیدا کرے۔
BEKLEEN SOAP
بی کلین
صابون
غسل کو صحت مند آرام دہ اور پُر فرحت بناتا ہے
QUIKKLEEN Soap
کوئک کلین
صابون
کپڑوں کو صاف تر اور جلد تر دھوتا ہے
بنگال آئل ملز لمیٹڈ
بنگال ہاؤس۔ کراچی۔ ٹیلیفون ۳۲۵۳۷
شاخ۔ حجازی بلڈنگ۔ سرکلر روڈ۔ لاہور

چھوٹا مسواک ٹوتھ برش

دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے

چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک

نایاب تحفہ ہے

جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور

جس کا استعمال بچوں کیلئے مفید ترین مشغلہ ہے

چھوٹا مسواک ہر چھوٹی اور بڑی دوکان پر ملتا ہے